بچوں کا پسندیدہ رسالہ

ماہنامہ

ساتھی

کراچی

جنوری ۲۰۱۶ء

بچوں کا کل پاکستان

مُشاعرہ

ساتھی رائٹرز ایوارڈ ۲۰۱۵ء

باتیں بڑوں کی چھوٹوں کے لیے

ساتھی رائیٹرز ایوارڈ اور مُشاعرہ
کی رپورٹ اندرونی صفحات پر
مُلاحظہ فرمائیں

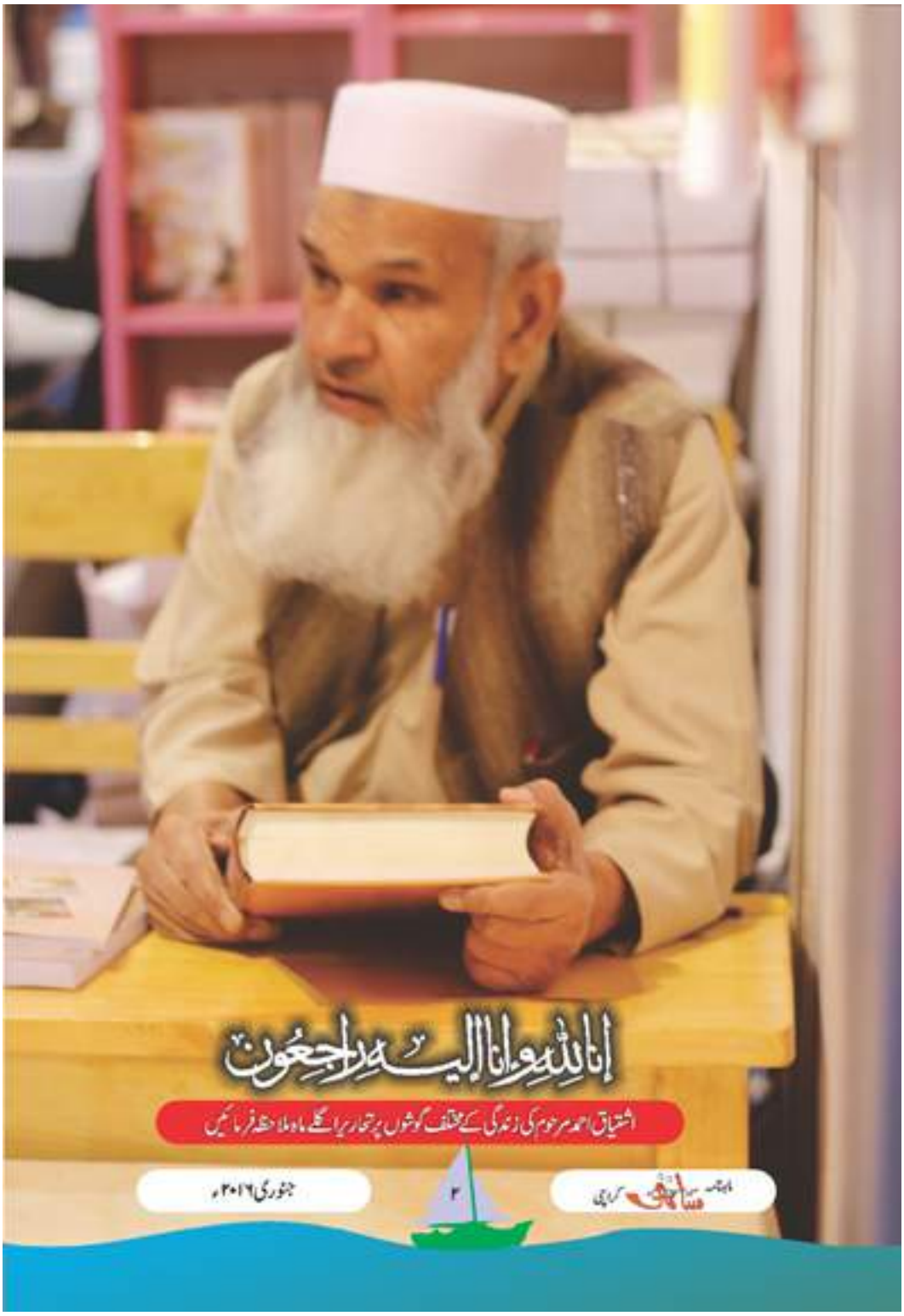
اناللہ وانا الیہ راجعون
اشتیاق احمد مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں پر تحاریر اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں
ماہنامہ ساتھی کراچی
۲
جنوری ۲۰۱۶ء

نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان
ماہنامہ ساتھی کراچی
چلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۱
جنوری ۲۰۱۶ء
قیمت ۳۰ روپے
مدیر
فصیح اللہ حسینی
مجلسِ ادارت
محمد طارق خان
عبدالصمد بھٹی
عبدالرحمٰن المومن
0334-3024835
شعبہ مارکیٹنگ
سید طلال علی
0333-2381277
اسامہ شیخ
0336-2246181
محمد یوسف منیر
سالانہ خریداری
رجسٹرڈ ڈاک 500 روپے
مشرقِ وسطیٰ 75 ریال
دیگر ممالک 35 ڈالر
ناشر سرفراز احمد
رابطہ کیجیے
ایف 206، سلیم ایونیو بلاک 13-B
گلشنِ اقبال، کراچی
پوسٹ بکس نمبر: 17982
فون نمبر: 34976468
اوقاتِ کار: شام ۵ تا رات ۱۰ بجے
monthlysathee@hotmail.com
satheecirculation@gmail.com
www.facebook.com/monthlysathee

ساتھی چٹخارے

۲۱	شیخ زید مسجد	ادارہ
۲۲	نیلم پری کی نیند	راحت عائشہ
۲۴	سیرت لائبریری	غلام مصطفیٰ سونگی
۲۹	ذرا کھلکھلائیے	قارئین
۳۳	ٹوتھ پیسٹ کا معما	انوشہ سروپ
۴۰	حمد رب جلیل (نظم)	ضیاء الحسن ضیا
۴۱	دلچسپ و عجیب	ظفر تسنیم
۴۳	یہ بھی دنیا ہے	ادارہ
۴۴	گل پاکستان مشاعرہ	عبدالرحمٰن مومن
۵۳	وہ فاتح عالم تھا (نظم)	نعیم الدین نعیم
۵۴	اُردو زباں ہماری	اطہر علی ہاشمی
۵۷	ساتھی رائٹرز ایوارڈ	عبدالصمد بھٹی

۶۳	ساتھی مصوری	قارئین
۶۴	ایک انچ کی کلی	رمشا جاوید
۶۸	شاعر سب شرمائے تھے (نظم)	شریف شیوہ
۷۰	تاریخ کی کھوج	قارئین
۷۷	آپ کی نگارشات	ننھے قارئین
۸۱	پانی کا سالمہ	قاضی طارق
۹۰	وقار محسن کی یاد میں	مجیب ظفر انوار حمیدی
۹۳	ستارے والی لڑکی	معروف احمد چشتی
۱۰۷	خط۔رے	قارئین

آپ کی تخلیق

۹۶	رنگ برنگی تھیلیاں	ماریہ فاروق	۱۰۱	شجرۂ نسب	عرشیہ نوید حسنات
۹۸	کوا اور ہنس	بسمہ شانزے پارس نواب	۱۰۲	آپ بھی کر سکتے ہیں	زاہدہ عروج تاج
۹۹	قصہ پانچ روپے کا	ھدیٰ محسن	۱۰۴	عیدی	اسماء سید

علیکم السلام

چلو بھائی نیا سال بھی آ گیا۔ یہ سال بہت زیادہ جلدی نہیں گزرنے لگے۔ ۲۰۱۵ء کی جنوری ابھی کل کی بات لگتی ہے۔

اچھا سب چھوڑیں یہ تو بتائیں کہ کیا نیا سال شروع ہوتے ہی چڑیوں کے چہچہانے میں کچھ زیادہ غنائیت آ جاتی ہے۔ کیا آسمان کچھ زیادہ نکھر جاتا ہے، چاندی کی چاندنی کا جلوہ آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے یا پھر سورج کی تمازت ہمیں بھلی لگنے لگتی ہے..... کیا ایسا کچھ ہوتا ہے۔ نہیں!

کیوں بھئی..... کیا شہروں میں درختوں کی کمی کی وجہ سے پرندوں نے آنا چھوڑ دیا یا پھر آسمان فضائی آلودگی کا شکار ہے۔ ہاں ہاں یہ بھی ہے کہ اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچنے کے سبب سورج کی گرمی بڑھ رہی ہے۔ اگر آپ بھی ایسا کچھ محسوس کرتے ہیں تو ایک پودا اپنے گھر کے باہر لگائیے اُس کی خوب دیکھ بھال کیجیے۔ غیر ضروری دھواں اور آگ لگانے سے گریز کریں تاکہ کائنات خوب صورت لگے۔ ہمارا ملک، ہمارا شہر..... ہمارا ٹاؤن اور ہماری گلی..... سب سے زیادہ خوب صورت ہو۔ نئے سال کی خوشی میں یہ چھوٹا سا کام تو کر سکتے ہیں ناں.....

بچوں کے معروف ادیب اور جاسوسی ناول نگار اشتیاق احمد بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے، مرحوم کے بچوں کے ادب پر بے پناہ احسانات ہیں۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

آپ کا بھائی

فصیح اللہ حسین

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ

سیما صدیقی

''مانی'' بیٹا.....! ذرا جلدی سے جا کر 'کلیجی' تو لے آؤ..... میں کب سے تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی اور تم ہو کہ ناشتہ کرتے ہی کمپیوٹر کھول کے بیٹھ گئے۔ چلو شاباش پہلے دوڑ کے کلیجی لادو۔''

میں نے ٹھنڈا سانس لیا، ''جی امی جان! ابھی لاتا ہوں..... بس ذرا ایک منٹ!'' امی کے دروازے سے مڑتے ہی میں نے 'ستاروں کی چال' نامی ویب سائٹ کھولی،

''یہ ہفتہ کیسا رہے گا!' کا کالم میرے سامنے تھا، ادھر کچھ عرصے سے میں باقاعدگی سے یہ کالم پڑھتا تھا۔ ابتدا میں یہ محض ایک شغل ہی تھا مگر اس کی کچھ باتیں حیرت انگیز طور پر سچ ثابت ہونے کے بعد میں شعوری یا لاشعوری طور پر اس کا بہت اثر لینے لگا تھا۔ اپنے برج 'حوت' کے کالم میں، میں نے آج کی تاریخ نکالی، لکھا تھا۔

'۱۶ دسمبر: صبح کا آغاز کسی خوشگوار واقعہ سے ہوگا۔ کوئی بچھڑا ہوا دوست آپ سے آن ملے گا۔''

''بچھڑا ہوا دوست! کون ہو سکتا ہے؟'' مجھے عجیب

سنسنی سی محسوس ہوئی۔

''فائق! جو پانچ سال قبل ہمارا پڑوس چھوڑ کر لاہور چلا گیا تھا یا میرا عزیز دوست 'صائم' جس نے چند سال قبل اسکول تبدیل کر لیا تھا اور جس کا رابطہ نمبر بھی کھو گیا تھا؟

امی گوشت ابو سے منگواتی ہیں، آج مجھ سے کہہ رہی ہیں، وہ بھی صبح صبح..... کیا واقعی قسمت مجھے کسی بچھڑے ہوئے عزیز سے ملوانا چاہتی ہے؟؟ ایک خوشگوار تجسس اندر ہی اندر کروٹیں لینے لگا۔

میں نے فوراً کمپیوٹر آف کیا اور کھڑا ہو گیا۔ میرے پاس موٹر سائیکل تھی لیکن میں پیدل ہی روانہ ہوا۔ بازار قریب ہی تھا۔ گوشت کی دکان پہ پہنچا تو لگا کہ شاید میں کچھ زیادہ ہی سویرے پہنچ گیا ہوں۔ قسائی ابھی کلیجی بالٹی میں ڈال کر دھو رہا تھا۔ اس نے کلیجی کو کانٹے میں پھنسا کر لٹکایا تو میں نے دیکھا اس میں سے کچھ جھاگ سا نکل رہا تھا۔ میں ڈر گیا کہ کلیجی باسی یا زہریلی تو نہیں؟ میں نے ڈرتے ڈرتے قسائی سے پوچھا۔

''یہ کلیجی میں سے سفید سفید جھاگ کیسا نکل رہا ہے؟''

قسائی نے ایک انتہائی گندہ جھاڑن اٹھایا اور کلیجی کو پونچھتے ہوئے بولا،

''ارے میاں! کچھ نہیں..... فریزر میں پڑی تھی ناں! خون جم کر کالا ہو رہا تھا۔ لوگ نخرہ کرتے ہیں اس لیے واشنگ پاؤڈر سے دھو دیا ہے اسے۔ دیکھو کیسی کھل گئی ہے، بالکل تازہ..... فریش!

قسائی نے کلیجی کو کانٹے پہ گھما گھما کر انتہائی تعریفی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا جیسے یہ بکرے کی نہیں اس کی اپنی کلیجی ہو۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک لیا۔ کلیجی کے بجائے میں نے ایک دوسری دکان سے آدھا کلو قیمہ خرید لیا۔ قیمے کی تھیلی ہاتھ میں جھلاتا میں سڑک پر چلا جا رہا تھا اور اسی سوچ میں ڈوبا تھا کہ کوئی دوست ابھی تک تو ملا نہیں.....! اچانک سائیڈ کی گلی سے ایک پیلے رنگ کا کتا نکلا اور تیزی سے سے میرے پیچھے آنے لگا، قیمے کی مہک نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور ڈر کے مارے قیمے کی تھیلی سینے سے لگا کر تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ کتے نے بھاگ لینے کو اپنی بے عزتی سمجھا اور ایک چھلانگ مار کر نزدیک آ پہنچا..... میں نے تھیلی فضا میں بلند کر لی۔ جھنجھلاہٹ کے مارے کتے نے میری پنڈلی پہ منہ مارا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کا دانت پوری طرح کام نہ دکھا سکا، کیوں کہ کسی راہ گیر نے عین وقت پر پھرتی سے پتھر اٹھا کر اسے دے مارا۔ احتجاجاً کتا 'پیں پیں' کی اظہار خفگی والی آوازیں نکالتا، بغلی گلی میں جا گھسا۔ خون پنڈلی سے رسنے لگا تھا، ہر چند کہ کتا اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا مگر اس کا اچٹتا ہوا وار بھی کافی تھا۔ زخم میں ہلکی سی جلن ہو رہی

تھی، جیسے کند چھری سے گوشت کھرچ دیا جائے۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ 'برمودا' پہننا کتنا خطرناک اور رسکی ہے۔ بہرحال کسی طرح گھر پہنچا۔ شکر ہے امی سامنے نہیں تھیں۔ جلدی سے کچن میں جا کر قیمے کی تھیلی رکھی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ غسل خانے میں جا کر زخم دھویا اور ڈیٹول لگایا، زخم میں جلن سی محسوس ہونے لگی۔ میری آنکھ میں آنسو آ گئے۔ اف میں کیا کروں۔ کیا یہ تھی آج کی خوشگوار صبح..... بچھڑا ہوا دوست! کیا یہ کالے دھبوں والا..... بڑی سی گلابی زبان اور خوف ناک تھوتنی والا پیلا کتا ہی میرا بچھڑا ہوا دوست تھا؟ میرا ذہن الجھ سا گیا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے بچپن میں کتے کا کوئی بچہ (پلا) پالا ہو اور امی نے اس کو پھکوا دیا ہو، آج وہ مجھے پہچان کر، مجھ سے آ ملا ہو لیکن اگر وہ میرا دوست ہوتا تو مجھے کاٹ کیوں کھاتا؟ شاید وہ بچھڑے ہوئے عزیز دوست کو یوں منہ موڑے بھاگتا دیکھ کر پاگل ہو گیا..... پاگل!!

اچانک مجھے خیال آیا کہ کتے کے کاٹنے پر چودہ انجکشن لگوانے پڑتے ہیں اور وہ بھی پیٹ میں! اگر میں نے بروقت انجکشن نہیں لگوائے تو کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں اور اپنے دوستوں کے پیچھے بھوں بھوں کر کے انھیں کاٹ کھانے نہ دوڑوں..... کیا امی کو سب کچھ بتا دوں؟ آخر میں کیا کروں؟ مارے پریشانی کے میں بستر پر ڈھے گیا۔ آنکھیں بند کیں تو خیال آیا کہ ''ستاروں کی چال'' میں کوئی بچھڑا ہوا دوست آپ سے آن ملے گا کی اگلی ہی سطر میں لکھا تھا،

''دوست نما دشمن سے ہوشیار رہیں!''

کہیں ستاروں کے معاملات میں کچھ الٹ پھیر تو نہیں ہو گئی۔ میں سخت کنفیوز تھا، وہ کتا میرا عزیز تھا یا دوست نما دشمن؟ ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ امی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا،

''بیٹا دروازہ کھولو..... دیکھو سمیر آیا ہے۔''

''سمیر!!'' میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں..... ''کیا یہ سمیر ہی تو نہیں میرا دوست نما دشمن، جس کی دوستی پہ مجھے ہمیشہ ناز رہا!

''کھٹ کھٹ..... کھٹ کھٹ'' امی نے دوبارہ دروازہ بجایا،

''کیا بات ہے نومی..... سمیر دروازے پر کھڑا ہے..... تم نکلتے کیوں نہیں؟''

''اچھا..... امی..... آ رہا ہوں..... بلکہ اسے یہیں بھیج دیں..... میرے کمرے میں۔''

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ سمیر آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ہے۔

''ارے یار! یہ کیا..... اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور تم کمرے میں گھسے بیٹھے ہو۔ میرا تو 'سی ویو' کا موڈ ہے، اشعر وغیرہ بھی جا رہے ہیں، چلو ہم دونوں بھی نکلتے ہیں۔ بڑا مزا آئے گا۔''

''مزا..... ! ہاں.....'' میں نے دل میں سوچا۔ میں خوب جانتا ہوں تم مجھے سمندر میں ڈبونے لے جا رہے ہو۔ میرے دوست نما دشمن۔''

مجھے چپ دیکھ کر سمیر کہنے لگا۔ ''کیا بات ہے، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے..... اور یہ ٹانگ پہ پٹی کیوں بندھی ہے؟''

میں کچھ دیر چپ رہا..... اسے بتاؤں یا نہیں.....؟ پھر 'سی ویو' کے پروگرام سے بچنے کے لیے میں نے سارا واقعہ کہہ سنایا.....!

''اوہ! حد ہو گئی یار..... جب کتا پیچھے لگ ہی گیا تھا تو تم قیمہ کی تھیلی پھینک دیتے وہ اسی میں الجھ جاتا۔ آدھا کلو قیمہ بچانے کے لیے تم نے پاؤ بھر اپنا گوشت نکلوا لیا! چلو اٹھو میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں، یہ بہت ضروری ہے۔''

میں مرہم پٹی کرا کے آدھے گھنٹے کے اندر واپس آ گیا۔ شکر ہے کہ بات محض ٹیٹنس (Tetanus) کے انجکشن پہ ٹل گئی۔ ڈاکٹر نے کہا، 'دانت گوشت میں پیوست نہیں ہوا، یوں سمجھ لیں کہ کتے نے آپ کو چکھ کر چھوڑ دیا۔'' ڈاکٹر کا یہ مذاق مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔ بہر حال آج صبح سے ہی میرے ستارے گردش میں تھے۔ 'سمیر' مجھے، میری ہی موٹر سائیکل پہ ڈاکٹر کے ہاں لے گیا تھا، واپسی میں مجھے گیٹ پہ اتارا تو کہنے لگا، 'چودہ انجکشن سے بچنے کی خوشی میں کیوں نا..... سی ویو پہ ٹریٹ ہو جائے تمھاری طرف سے! چلتے ہو!''

میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا، 'میرا بالکل موڈ نہیں..... سر چکرا رہا ہے!''

''اچھا!!'' سمیر موٹر سائیکل سے اترے بغیر بولا۔ ''چلو تو پھر میں چلتا ہوں، شام کو تمھاری بائک واپس کر جاؤں گا!'' خلاف توقع اس صورتحال پہ ابھی میں بھونچکا ہی تھا کہ سمیر نے بائک اسٹارٹ کی اور یہ جا اور وہ جا! سمیر کی یہ بے تکلفی کوئی نئی بات نہ تھی لیکن اس وقت مجھے بہت کھلی۔

اندر آیا تو امی کی نظر پڑ گئی، لنگڑاتے دیکھا تو گھبرا

دنیا کا سب سے جھوٹا آدمی

ایک آدمی جھوٹ بولنے کی وجہ سے بڑا مشہور تھا۔ ایک بوڑھے آدمی کو پتا چلا تو اس کی اصلاح کی نیت سے اس کے پاس گیا اور بولا: ''بیٹا میں نے سنا ہے کہ تم دنیا کے سب سے جھوٹے آدمی ہو۔''

آدمی بولا: ''دنیا کو دفع کریں جی، میں تو آپ کو دیکھ کر سخت حیران ہوں، اس عمر میں بھی یہ حسن، یہ جمال یہ دلکشی۔''

بوڑھا آدمی شرماتے ہوئے بولا: ''ہائے اللہ! یہ دنیا والے بھی کتنے ظالم ہیں۔ اچھے بھلے آدمی کو جھوٹا کہتے ہیں۔''

محمد اقبال قریشی، لاہور

گئیں۔ بڑی مشکل سے بہانے بنا کر ان کی پریشانی دور کی، کہہ دیا کہ گر گیا تھا، کتے کا ذکر گول کر گیا، کسی طرح کمرے میں پہنچا۔ امی نے گرم دودھ دیا، وہ پیا اور دوا کھا کر گہری نیند سو گیا۔

''کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ!'' دروازے کی کھٹ کھٹ سے آنکھ کھلی۔ ذہن کچھ ماؤف سا محسوس ہوا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ دن ہے یا رات؟ گھڑی دیکھی تو شام کے چھ بجے تھے۔ بہرحال بستر سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھولا۔

''یہ کیا!!'' سامنے سمیر کھڑا تھا اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں میں چپ کھڑا اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا..... وہ چاہتا تھا کہ میں پوچھوں کہ ''کیا ہوا؟'' میں ساکت کھڑا رہا تو بالآخر وہ خود ہی بولا،

''یار آج تو بری ہوئی۔ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بائک پہ بھی ڈینٹ پڑ گیا اور میرے گھٹنے پہ چوٹ آئی..... یہ دیکھو!''

یہ کہہ کر سمیر نے اپنی پتلون کا پائنچہ سرکا گھٹنا دکھایا۔ گھٹنا واقعی سوجا ہوا تھا، چند خراشیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سرسری نگاہ ڈالی پھر کچھ کہے بغیر موٹر سائیکل کی طرف متوجہ ہو گیا..... ایک جانب سے وہ قدرے پچک سی گئی تھی۔ افسوس کے مارے میں گنگ سا رہ گیا۔ سمیر نے دیکھا کہ میں چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوں اور کچھ بولنے کو تیار نہیں تو واپس جانے کے لیے پلٹ گیا، وہ باقاعدہ لنگڑا رہا تھا۔

''ہونہہ! میں خوب جانتا ہوں..... میرے دوست نما دشمن..... تم چاہتے ہی نہیں تھے کہ میرے پاس کوئی بے داغ شاندار موٹر سائیکل ہو!''

اللہ اللہ کر کے دن کا اختتام ہوا۔ پورا ہفتہ کچھ یوں ہی سا گزر گیا..... ہاں بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ سمیر میری غیر موجودگی میں، امی کو بتا کر موٹر سائیکل لے گیا اور اسے بنوا کر لے آیا۔ اب وہ پہلے کی طرح زبردست ہو گئی..... بالکل بے نشان! میں نے خوش ہو کر امی کو موٹر سائیکل دکھائی۔ ''دیکھیے امی کیسی زبردست ہو گئی ہے!''

امی نجانے کیوں کچھ چپ سی ہو گئیں پھر بولیں۔

''بہت پروا ہے موٹر سائیکل کی۔''

میں نے کہا، ''ہاں! کیوں نا ہو، میری جان ہے اس میں!''

امی نے کہا ''بیٹا میں نے ایک قول پڑھا تھا جو مجھے بہت اچھا لگا، وہ کچھ یوں تھا، ''انسان پیار کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کرنے کے لیے..... لیکن افسوس کہ ہم چیزوں سے پیار کرتے ہیں اور لوگوں کو استعمال!''

پھر مسکراتے ہوئے بولیں، ''موٹر سائیکل اب بھی تمھاری اور سمیر کی دوستی سے زیادہ شاندار نہیں۔''

میں نے کندھے اچکا کر کچھ نہ سمجھنے کی ایکٹنگ کی۔ شاید سمیر نے موٹر سائیکل والی بات پہ میری خفگی کی، امی سے دل کھول کے شکایت کی تھی۔ موٹر سائیکل کا ڈینٹ تو ٹھیک ہوگیا مگر میری اور سمیر کی دوستی میں دراڑ سی آ گئی۔

☆.....☆

ہفتے کے اختتام پہ میں نے حسب معمول، صبح صبح ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا!'' کا کالم نیٹ پہ ڈھونڈ نکالا۔ میرے اسٹار میں لکھا تھا،

''کسی قریبی عزیز کی جانب سے شدید ناراضگی کا امکان ہے۔ آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ سفر وسیلہ ظفر ثابت ہوگا۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی!''

یہ ساری خبریں اچھی تھیں، خاص طور پر آمدنی میں اضافہ تو بریکنگ نیوز تھی میرے لیے، لیں یہ قریبی عزیز کی ناراضگی والی بات، ذرا پریشان کن تھی۔ بہرحال دیکھا جائے گا میرا موبائل بجنے لگا، اسی اثنا میں امی نے ناشتہ تیار ہے!'' کی آواز لگائی۔ آج ابو گھر پہ تھے لہٰذا ناشتے کی میز پہ فوراً پہنچنا ضروری تھا۔ امی کے مقابلے میں وہ مجھ پہ کافی سختی کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا،

کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نگاہ سے!

لہٰذا سونے کا نوالہ کھلانے کی ذمہ داری امی کی تھی اور شیر کی نگاہ رکھنے والا کام ابو نے لے رکھا تھا۔ میں دسترخوان پہ پہنچا تو ابو بھی اخبار لیے وہاں آ گئے، کرسی کھسکاتے ہوئے بولے،

''ہاں بھئی صاحب زادے، پڑھائی کیسی جارہی ہے؟''

''جی! جی..... ٹھیک جارہی ہے۔ کوچنگ بھی جارہا ہوں۔ میتھ اور فزکس کے لیے!''

''اچھا.....! تو ذرا ناشتے کے بعد اپنی حساب کی کتاب تو لے کر آنا، ذرا میں بھی دیکھوں کہ کتنی ٹھیک چل رہی ہے پڑھائی.....!''

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بے دلی سے ناشتہ ختم کیا اور بادل نخواستہ بستہ اٹھا لایا۔ ابو ان والدین میں سے تھے جو سارا سال تو بچوں کو پوچھتے نہیں..... کہ کس جماعت میں آ پہنچے ہیں یا پڑھائی کے معاملات کیسے ہیں؟ لیکن اچانک کسی دن خیال آ جائے تو بچے کی شامت بلا دیتے، پڑھائی ٹھیک نہ چل رہی ہو تو ٹھیک ٹھاک ٹھکائی بھی کر دیتے ہیں۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا۔ باپ سے بڑھ کر قریبی عزیز کون ہوسکتا تھا؟ ان کی شدید ناراضگی کا سوچ سوچ کر دماغ کا فیوز اڑ گیا تھا یہی وجہ ہے کہ آسان سے آسان سوال بھی میں حل نہیں کر پایا۔ ابو کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا، کہنے لگے، جب تک یہ سارے سوال حل نہ ہوں، نہ تم اس میز سے اٹھو گے اور نہ میں! کیا سیکھا ہے سارا سال اسکول میں اور کوچنگ میں!

جب ڈانٹ ڈپٹ کا دورانیہ بڑھتا ہی چلا گیا اور ناشتے کے بعد کھانے کا وقت ہو چلا تو آخرامی نے مداخلت کی،

(ماں جو تھی) کہنے لگیں،

''ارے چھوڑیے! آپ بھی اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ آپ سے تو اتنا ڈرتا ہے، بھلا پڑھے گا کیسے؟ سردیوں کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ میں اسے نسیم بھائی کے پاس حیدر آباد بھیج دوں گی، وہ درجنوں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ ماموں سے پڑھے گا تو حساب میں ماسٹر ہو جائے گا!''

میں نے شکر گزاری سے امی کو دیکھا۔ ابو بھی ڈانٹتے ڈانٹتے تھک چکے تھے، شاید اب خود بھی اٹھنا چاہتے تھے، لہٰذا..... کچھ نیم رضامندی کے تاثرات کے ساتھ میز سے اٹھ گئے اور بولے، ''چلو دیکھتے ہیں..... ماسٹر ہوتا ہے یا ہیڈ ماسٹر!''

میں کمرے میں آیا تو تھک کر بستر پر گر گیا۔ اتنی ڈانٹ کھا کر آیا تھا مگر اس کی ساری بدمزگی ہوا ہو گئی تھی۔ اب میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ حیدر آباد کا سفر کروں گا..... وہ سفر جو وسیلہ ظفر ثابت ہوگا..... یعنی کامیابی لائے گا..... ماموں کے گھر مزے کروں گا..... واہ! میری تو لاٹری نکل آئی!

☆.....☆

بس سروس کافی اچھی تھی۔ ایئر کنڈیشن بس میں، چوڑی سی سیٹ پہ میں پھیل کر بیٹھ گیا، گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا موڈ خوشگوار تھا، میں غیر معمولی آزادی محسوس کر رہا تھا۔ سوچا کہ کیوں نا..... موبائل پہ کوئی گیم شروع کر دوں، وقت اچھا گزر جائے گا۔ سیٹ پہ ذرا ترچھا ہو کر ہاتھ کی دو انگلیاں جیب میں ڈالیں۔ اوہ! اگر یہ کیا.....؟ جیب خالی تھی نہ موبائل تھا نہ والٹ! بس پہ چڑھتے وقت رش میں کسی ماہر جیب کترے نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی تھی۔ میں لُٹ چکا تھا۔ آہ! میں کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جلدی جلدی دوبارہ جیبیں ٹٹولیں، ہینڈ

باز

چیل کی قسم ایک شکاری پرندہ، عقاب سے چھوٹا اور کمزور ہوتا ہے۔ چونچ چھوٹی اور مڑی ہوئی، پنجے تیز اور نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کا شکار پرندے اور چھوٹے چھوٹے دودھ پلانے والے جانور ہیں۔ امریکا اور ایشیا میں اس کی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہ اور امراء اس کو سدھا کر شکار کے کام میں لاتے تھے اور اس مطلب کے لیے ''میر شکار'' مقرر تھے۔ سدھے ہوئے باز کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی اور جب شکار نظر آتا تو پٹی کھول کر اسے اڑا دیا جاتا۔

مرسلہ: سلمان احمد، کراچی

بیگ میں بھی دیکھا مگر افسوس کہ والٹ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں ایک فقرہ گونج رہا تھا۔

آمدنی میں اضافہ ہوگا..... آمدنی میں اضافہ ہوگا!

شاید امی ٹھیک کہتی تھیں کہ ''یہ ہفتہ کیسا رہے گا!'' کا کالم بالکل بکواس ہوتا ہے۔ امی ویسے بھی اس طرح کی پیشن گوئیوں پر یقین رکھنے کے سخت خلاف تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے، ہماری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آ ہی جاتا ہے پھر اسے ادھر ادھر سے معلوم کرنے کی جستجو کیسی؟ امی کا کہنا درست ہے یا آج ستارے ہی کچھ بھٹک گئے ہیں۔ میں الجھ گیا تھا، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جیب کترے صاحب بھی میرے ہم ستارہ ہوں اور ان کی آمدنی میں اضافہ اس لیے ہوگیا کہ ان کے ستارے مجھ سے زیادہ زوروں پر ہوں۔

بس کے مسافروں کو پتہ چلا تو سب نے تعزیتی انداز میں افسوس کا اظہار کیا، کچھ لوگوں نے حسب توفیق اپنی جیب کٹنے کے واقعات بھی سنائے۔ بہرحال کس طرح ماموں کے ہاں پہنچا اور کراچی اپنے 'خیریت' سے پہنچنے کی اطلاع دی۔

ماموں کے ہاں پہنچتے پہنچتے جو جوش وخروش گھر سے لے کر چلا تھا وہ جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ ماموں جان نے گرمجوشی سے گلے لگایا، ممانی نے بریانی اور شامی کباب سے تواضع کی، کھانے کی میز پر ایک 'اجنبی' سفید مکلف کرتا پائجامہ، سیاہ ٹوپی پہنے بظاہر بڑے اچھے اور بے ضرر سے آدمی معلوم ہوئے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ وہ ماموں جان کے دوست تھے، وہ بھی کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے تھے، موصوف 'شاعر' تھے، کیسے شاعر تھے یہ بھی اسی رات پتہ چل گیا۔ ان کا نام 'اختر حاصل پوری' تھا۔ ماموں نے بتایا کہ وہ جلد ہی اپنا مجموعہ کلام شائع کرا رہے ہیں اور اشاعت سے قبل کسی قابل اعتماد دوست کو اپنا کلام سنانا چاہتے ہیں۔ (چاہے بعد میں وہ دوست، دوست نہ رہے اور نہ کسی قابل) میرا بستر ماموں کے کمرے میں لگا دیا گیا، جبکہ ماموں کے دوست کا قیام بھی وہیں تھا۔ (دراصل ماموں کا مکان مختصر سا تھا)

رات ڈھائی بجے تک 'اختر حاصل پوری' مجھے اپنا کلام سناتے رہے۔ میں اخلاقاً سر دھنتا رہا۔ ماموں جو اصل مخاطب تھے، تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سو چکے تھے۔ اس دوران اختر حاصل پوری روئے سخن پوری طرح میری جانب ہوگیا۔ جب وہ پانی پینے کے لیے درمیان میں رکے تو میں نے نہایت عاجزی سے انھیں بتایا کہ مجھے شاعری کی کوئی خاص سمجھ نہیں! اس پہ انہوں نے فرمایا کہ 'کچھ سنو گے تو ذوق پیدا ہوگا ناں!''

میں نے پھر فرار کی کوشش کرتے ہوئے کہا، مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں اور میں ماموں سے حساب پڑھنے آیا ہوں۔اس پہ انھوں نے کہا،

''ارے بیٹا! انھیں کہاں فرصت، پہلے دفتر جاتے ہیں۔ واپسی میں ٹیوشن پڑھانے نکل جاتے ہیں۔ رات کو کھانے کے وقت تک واپس آتے ہیں..... بے چارے!''

مجھے ماموں کے بے چارے ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر لیٹنا چاہا تو اختر حاصل پوری نے پھر تکیہ کے نیچے سے ایک پرزہ نکال لیا اور بولے،

ہاں تو سنو، بیٹا خبریں تو سنتے ہوناں..... یہ نظم میں نے حالات حاضرہ کے اہم موضوع پہ کہی ہے، ذرا توجہ طلب ہے،

میں نے آتی ہوئی جمائی کو بڑی شدت سے روکا، جناب حاصل پوری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر ارشاد فرمایا:

بھائی بیگم کا میرے گھر میں مہماں ہوا
گوشت لینے جو سرکار نے ہم کو بھیجا
سوچا اچھا سا گوشت لے لوں کیوں نا
بھینس کا سمجھ کے بیگم نے خوب بھنا
نہ بولا میں کہ گوشت کی قسم ہے کیا
کیوں بتاتا کیا تھا میں اتنا گدھا؟

کیا سمجھے..... ہے نا خوب! حاصل پوری نے خود ہی اپنے اشعار کا مزا لیا۔ میرے تو منہ کا ذائقہ 'گدھے کے گوشت' کے ذکر سے ہی عجیب سا ہوگیا۔ لہٰذا منہ سے صرف ''جی'' نکلا۔

مگر اس ''جی'' نے بھی حاصل پوری کا حوصلہ بڑھا دیا کہنے لگے اسی موضوع پر ایک اور چیز کہی ہے۔ بالکل نیا خیال ہے ذرا توجہ سے سننا۔

بچہ میرا اٹھنا نے لگا ہے
اس گوشت کا مگر اپنا مزا ہے
بدتمیزی پہ جو میں نے ماری دولتی
ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے وہ رونے لگا ہے

کیوں ہے نا..... مزے دار..... سمجھ رہے ہو نا..... اس میں جو گہرائی اور ہلکا طنز پوشیدہ ہے۔ انہوں نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''جی حاصل پوری صاحب! میں سمجھ گیا مگر اب مجھے نیند آرہی ہے۔ سفر نے تھکا دیا ہے ویسے بھی تین بج رہے ہیں، رات کے۔''

میں نے سارا اخلاق بالائے طاق رکھ کر جان چھڑانی چاہی۔

''ہاں ہاں! بیٹا سو جانا، سونے کو عمر پڑی ہے۔ معلوم نہیں آج کل لوگوں کو سونے کا کیا مرض ہے۔ دیکھو اگر اللہ میاں نے تمہیں زندہ رہنے کے لیے اسی سال دیئے ہیں تو چالیس سال تو تم سو کر ضائع کردو

سوبار

ایک عورت نے سگنل توڑا، سارجنٹ نے روک لیا۔
عورت: ''پلیز مجھے جانے دیجیے، میں ایک ٹیچر ہوں اور میری کلاس کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' سارجنٹ کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ نے یوں سر ابھارا جیسے ہری ہری گھاس میں سے زہریلا کوبرا سر اُٹھاتا ہے۔
''ہاہاہا.....'' سارجنٹ نے قہقہہ لگایا: ''اس پل کا تو میں ساری زندگی انتظار کرتا رہا۔ اب جلدی سے یہ جملہ ۱۰۰ بار لکھ کر دو، اب میں کبھی سگنل نہیں توڑوں گی۔''

محمد اقبال قریشی، لاہور

گے..... ہے نا افسوس کی بات!''

میں نے دل میں سوچا، گویا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی شاعری سنتا رہوں اور سو کر نہیں رو کر اپنے چالیس سال گزار دوں۔ میں نے بے چارگی سے ماموں کی طرف دیکھا، جواب ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے اور بدستور بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ان کے حال پہ افسوس ہوا۔ ابھی میں ماموں کی طرف متوجہ ہی تھا کہ حاصل پوری نے اپنے پلندے میں سے ایک اور کاغذ نکال لیا اور کہنے لگے، بس بیٹا سونے سے پہلے یہ سن لو، یہ شاعر اور شاعری کی ''ناقدری'' سے متعلق ہے۔
عرض کیا ہے۔

لکھاری دیکھے بھاری بھر کم
شاعر مگر تھے اچھے کم کم

محفل میں بیٹھا، میں جو دھم دھم
اٹھ گئے لوگ نجانے کیوں ایک دم

مجھے حاصل پوری کی سادگی پہ حیرت ہوئی کہ وہ یہ نہ جان سکے کہ حاضرین مشاعرہ اٹھ کیوں گئے؟ یہ شاعری تو کوئی جانثار دوست ہی سن سکتا ہے یا پھر اس کا کوئی نکما بھانجا! اسی اثناء میں حاصل پوری نے اگلے اشعار کی تیاری پکڑ لی۔ فرمایا، یہ بھی شاعر کے دل کی آواز ہے:

میں ہوں شاعر بڑا، مجھے ہلکا نہ لے
کھا شوربہ بھی صرف، پھلکا نہ لے
دل بڑا کر کے مجھے تو، داد تو دے
روٹھ کے چل دیا میں، تو آواز تو دے

کاش آپ روٹھ کے چل دیں۔ میں آواز تو کیا، سانس تک نہیں لوں گا۔ میں اب تکیہ سیدھا کر کے باقاعدہ لیٹ گیا۔ (اب تک نیم دراز تھا) میں نے اخلاقاً بھی ان اشعار کی شعریت یا مقصدیت پہ کوئی تبصرہ نہ کیا اور اگر کیا تو وہ جمائی کی صورت، اگر شاعر اسے بھرپور تبصرہ سمجھے تو!

ہاں بیٹا! سو رہو..... مگر سونے سے پہلے چند آخری اشعار جو میری 'گھریلو زندگی' سے متعلق ہیں وہ سن لو،

ڈالی پہ نارنگی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی
بیوی کچھ بے ڈھنگی دیکھی

بچوں میں بدرنگی دیکھی

میں نے یہ اشعار سن کر ٹھنڈی سانس لی اور سوچا کہہ دوں، حاصل پوری صاحب، بچوں کے رنگ تو آپ کا کلام سن سن کر اڑ گئے ہوں گے اور بیگم آپ کے ساتھ مسلسل رہنے سے بے ڈھنگی ہوگئی ہوں گی۔ پھر یہ شکوہ کیسا؟ مگر یہ کہنے کے بجائے صرف یہی کہہ پایا،

''حاصل پوری صاحب! مجھے نیند آ رہی ہے، مجھے سونا ہے اور صبح کی گاڑی سے کراچی جانا ہے۔''

''ہائیں! اتنی جلدی..... آج ہی تو آئے ہو..... پھر حساب نہیں سمجھنا کیا ماموں سے؟''

دل میں آیا کہ کہہ دوں، حاصل پوری صاحب! آپ کی شاعری سہنے سے بہتر ہے کہ میں واپس جا کر ابو کے جوتے کھالوں!

میں نے آنکھیں موند لیں، ذہن سخت پریشان تھا۔ کیا انکل حاصل پوری سے ملاقات ہی وہ 'کامیابی' ہے جس کی مجھے نوید دی گئی تھی؟ میرا ستارہ اپنی چال بھول کر کسی گردش میں آ پھنسا ہے یا اب تک جو کچھ 'سچ' ثابت ہوتا رہا وہ محض ایک 'تکا' تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر اب نیند کوسوں دور تھی۔

ارادہ تو اگلے روز ہی نکلنے کا تھا مگر ماموں ممانی مانے ہی نہیں، ماموں نے چھٹی والے دن بیٹھ کر پڑھایا، ممانی نے کچھ روپے دیے کہ ماموں کے ساتھ جا کر اپنی پسند سے خریداری کرلو۔ میں نے چپ چاپ نوٹ رکھ لیے اور بعد میں اسی سے واپسی کا ٹکٹ لیا۔

اس وقت میں، بس میں بیٹھا تھا، جس کا رُخ کراچی کی طرف تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اب کبھی 'ستارے بولتے ہیں' یا 'یہ ہفتہ کیسا رہے گا' جیسے کالم کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ امی ٹھیک کہتی ہیں، یہ جستجو بیکار ہے۔ اوّل تو ہمیں آگے کا حال معلوم ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا ہم برے حالات و واقعات کو 'ڈیلیٹ (Delete)' کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟ اچھا اور برا وقت آتا اور جاتا رہتا ہے، چنانچہ بہتر وہی ہے جو چچا 'غالب' نے فرمایا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ، گھبرائیں کیا!

☆.....☆

مشتاق یوسفی کے شگوفے

☆.....ایک دفعہ شفقت نے کہا: ''فوزیہ آج میری امی آ رہی ہیں، کچھ بنالو۔''

محترمہ نے منہ بنالیا۔

☆.....اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کردیجیے۔

مرسلہ: طارق فرمان، کراچی

ڈھونڈو گے تو جانیں گے.....ورنہ ہم نہ مانیں گے

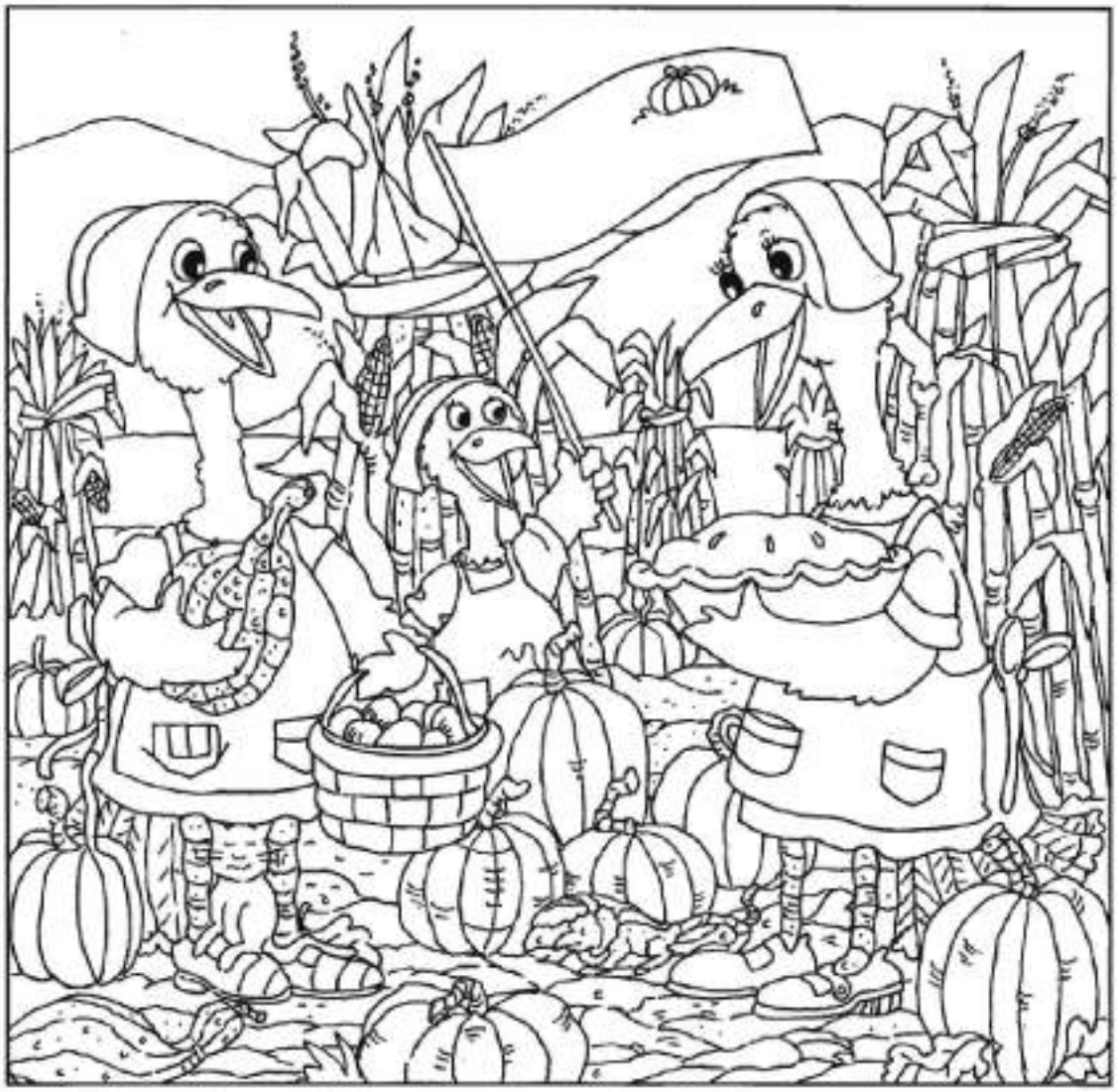

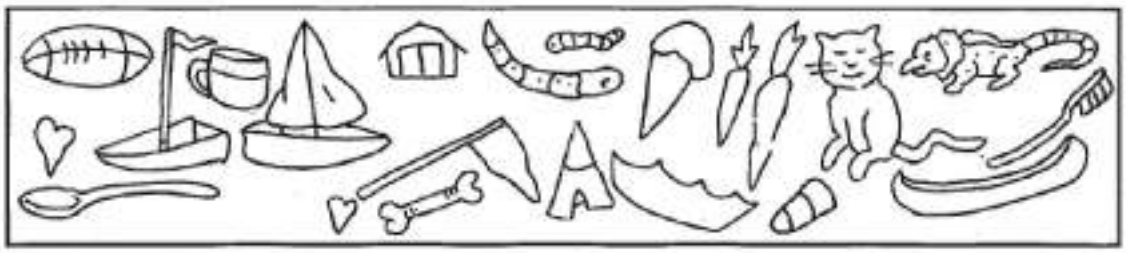

عالمِ اسلام کی شاہکار مساجد

شیخ زید مسجد متحدہ عرب امارات

شیخ زید مسجد متحدہ عرب امارات کے پہلے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کے حکم پر تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد ۱۱ سال (۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۷ء) میں تعمیر ہوئی۔ یہ عرب امارات میں سب بڑی مسجد ہے۔ شیخ زید مسجد اسلامی اور ثقافتی مرکز بھی ہے جس میں سیکھنے کے بہت مواقع ہیں۔ مسجد کے شمال مشرقی جانب ایک شاندار لائبریری بھی قائم ہے جس میں روایتی اور اسلامی کتب کا ایک نادر خزانہ موجود ہے۔ اس لائبریری میں ۲۰۰ سال پرانی نایاب کتب بھی موجود ہیں جو عرب امارات کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ ۱۳۰ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر کھڑے چار مینار ۳۵۰ فٹ اونچے ہیں اور اس کے ۸۲ ماربل کے گنبد ہیں۔ اس مسجد کے صحن کا رقبہ ۱۸۰۰۰۰ مربع فٹ ہے۔ جس میں ماربل اور پچی کاری کا کام نہایت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں ۴۰ ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مرکزی ہال میں ۷ ہزار نمازیوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ جبکہ اطراف میں دو چھوٹے ہال ہیں اور ہر ہال میں پندرہ سو خواتین بھی نماز ادا کر سکتی ہیں۔ ہال کے اوپر مرکزی گنبد کا قطر ۱۰۶ فٹ ہے جو کہ صحن سے ۲۷۹ فٹ بلند ہے۔ مسجد پر کل ۲ بلین درہم کی لاگت آئی ہے۔

نیلم پری کی کہانی

راحت عائشہ

نیلم ایک ننھی خوب صورت پری تھی۔ وہ ست بھی تھی اس لیے اُسے زیادہ نیند آتی تھی۔ اس کی دوست پریاں اسکول پہنچ کر بادلوں کے اوپر ٹہلتے ہوئے اپنا سبق یاد کرتیں اور نیلم کو نرم ملائم بادلوں پر نیند آ جاتی تھی۔ ایک دن استانی نے بہت زیادہ کام دیا۔ نیلم نے سوچا کہ کچھ دیر سو جاتی ہوں۔ کام بعد میں کروں گی۔ وہ سو گئی۔

اسکول کے بوڑھے پرنسپل کو نیلم کی بہت شکایتیں مل رہی تھیں۔ انھوں نے نیلم کے لیے ایسے کام بھی تجویز کیے جن سے وہ نیند پر قابو پا سکتی تھی لیکن نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بالآخر انھوں نے ایک حل ڈھونڈ نکالا

ایک دن وہ اسکول آنے کے لیے بادل پر سوار ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں مزے مزے کی نیند لینے لگی۔ یہ دیکھ کر پرنسپل نے ہوا سے کہا کہ بادل کے قریب سے تیزی سے گزرو۔ ہوا تیزی سے گزری تو بادل روئی کے گالوں کی مانند بکھر گیا اور نیلم چھپاک سے سمندر میں جا گری۔

پانی میں گرنے سے نیلم کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے آپ کو پانی میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے پروں سے پانی جھاڑا اور اسکول کی طرف اُڑنے لگی۔ اسے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن کے بعد نیلم نے ہر کام وقت پر کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ دوبارہ پانی میں گر کر سب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

سیرت لائبریری

محمد مصطفیٰ سومرو

علم و دانش کی دنیا جہاں سے کئی روشن راہیں نکلتی ہیں

شاندار اور حیران کن سیرت لائبریری میں کچھ عرصہ قیام کے بعد پاکستان کے نامور ادیب، دانشور اور سیرت نگار پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم نے مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات کچھ یوں لکھے تھے: "سیرت لائبریری شہداد کوٹ، پاکستان میں موجود کتب خانوں کا دل ہے۔ شہداد کوٹ جیسے دوردراز اور چھوٹے سے شہر میں اس طرح کی لائبریری کا قیام کسی معجزے سے ہرگز کم نہیں۔"
واقعی یہ لائبریری کوئی معجزہ دکھائی دیتی ہے۔ سچ ہے کہ پورے سندھ میں خاص طور پر اور پورے پاکستان میں عام طور پر اس طرح کی لائبریری کی مثال ملنا بے حد مشکل ہے۔

درحقیقت کتب خانے علم فہم، ادب اور شعور کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کتب خانے، زبان،

تہذیب، ثقافت اور اخلاقیات کے خزانے بھی سمجھے جاتے ہیں۔ سیرت لائبریری شہداد کوٹ بھی ایسا ہی ایک علمی خزانہ ہے، جس سے دنیا بھر کے علم کے متوالے اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق استفادہ کررہے ہیں۔

پاکستان کے ذاتی کتب خانوں میں بہت ہی شہرت یافتہ یہ لائبریری نامور ادیب، استاد، شاعر، سیرت نگار اور سیرت کے حوالے سے رقم کی گئی کتب پر پانچ مرتبہ حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ پانے والی ایک سدا بہار شخصیت پروفیسر سید گل محمد شاہ گل بخاری کے اعلیٰ علمی معیار اور ذوق کا واضح عکس ہے۔

پروفیسر گل بخاری ایک باعمل عالم ہونے کے ناتے ہمیشہ علم و دانش کی جوت جلائے رکھتے ہیں۔ وسیع مطالعہ، علم، دانش اور کتب سے محبت ان کی ہمہ گیر شخصیت کی علامات ہیں۔ آپ بتاتے ہیں۔ ''یہ ساری کتابیں میری قابل اعتماد دوست ہیں۔ یہ مجھ سے ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہیں اور اس طرح میرے ذہن کو کشادہ اور وسیع کرتی رہتی ہیں۔ میں ان کے درمیاں رہ کر بے حد مطمئن اور مسرور ہوتا ہوں۔ میں ایک دن مرجاؤں گا، لیکن یہ زندہ رہیں گی کیوں کہ کتابیں موت سے ناآشنا ہوتی ہیں۔''

پروفیسر گل بخاری کی طرف سے قائم شدہ یہ ذاتی کتب خانہ نایاب اور عالیشان کتب کے ذخیرے کے لحاظ سے سندھ کا بہترین کتب خانہ تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور سیرت رسولؐ کے متعلق تحقیق کرنے والے اسکالرز کے لیے یہ کتب خانہ بڑی کشش رکھتا ہے۔

سیرت لائبریری کا غیر شعوری قیام 1974ء میں عمل میں آیا تھا۔ بخاری صاحب خود ان دنوں اسکول کے طالب علم تھے۔ باقاعدہ اور شعوری طور پر اس زبردست لائبریری کو 1980ء میں قائم کیا گیا اور اس کے لیے مستطیل ہال نما ایک بڑی اور کشادہ عمارت بھی تعمیر کروائی گئی۔ حال ہی میں اس عمارت میں توسیع کی گئی ہے۔ ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کروایا گیا ہے تاکہ ملک کے دور دراز علاقوں سے آنے والے محقق سہولت سے قیام کرسکیں۔

سیرت لائبریری شہداد کوٹ میں موجود کتب کی تعداد پچاس ہزار ہے اور یہ تمام کتب ایک اندازے کے مطابق ایک سو سے بھی زائد مضامین پر بڑی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یوں کہا جائے کہ دنیا کے تقریباً ہر موضوع پر لکھی گئی کتب اس لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ علوم القرآن، تفسیر، سیرت، علوم الحدیث، احادیث کی شرح، فقہ، شخصیات، اسلامی تاریخ، تاریخ عالم، ممالک کی تاریخ، سوانح حیات، سفر نامے، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، لطیفیات، غالبیات، اقبالیات، طب، سائنس، لغات پر لکھی ہوئی کتب اس

لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچی، براہوی ، کشمیری، ہندکو، بلتی، بنگالی، جاپانی، چینی ،گجراتی، ملیالم، ترکی، روسی، فرانسیسی، جرمن اور افریقی زبانوں کا نثری ادب اور شاعری کا ایک بہت بڑا خزانہ بھی سیرت لائبریری میں موجود ہے۔ یوں بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کچھ نایاب کتب شہداد کوٹ میں ضرور مل جائیں گی۔

اس لائبریری میں سیرت پاک پر نثر اور نظم میں مرقوم مختلف زبانوں میں تقریباً بیس ہزار کتب موجود ہیں۔ یہ ساری کتب منتخب، بنیادی اور حوالہ جاتی کتب ہیں۔ سیرت لائبریری میں پانچ سو سال پرانی سیرت کی کتب بھی موجود ہیں تو ایک ماہ پہلے شایع ہونے والی تازہ ترین سیرت کی کتاب بھی یعنی اس لائبریری میں کتب کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کا پورا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی ساٹھ زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر یہاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن پاک پر لکھی گئی دیگر کئی اہم اور بنیادی کتب کا ایک شاندار ذخیرہ حیران کردیتا ہے۔

سیرت لائبریری میں دو سو برس پرانی کتب کی تعداد لگ بھگ تین ہزار ہے، جبکہ پانچ ہزار نایاب کتب ایک سو برس پرانی ہیں۔ مزید براں، سینکڑوں کی تعداد میں فوٹو اسٹیٹ شدہ دنیا کی نایاب کتب اور قلمی نسخے بھی یہاں دستیاب ہیں۔

سیرت لائبریری کی کتب دنیا کے ستر سے زائد ممالک سے حاصل کی گئی ہیں۔ خاص طور پر سعودی عرب، مصر، ایران، ترکی، شام، ہندوستان، افغانستان، انگلستان، مراکش، الجزائر، یمن، انڈونیشیا، مالدیپ، ملائیشیا، چین میں شائع کردہ کتب کی تعداد سب سے بڑھ کر ہے۔ کتب کے حصول کے سلسلے میں پروفیسر گل بخاری بتاتے ہیں، میں خصوصاً اسلامی ممالک کے اشاعتی اداروں سے رابطے میں رہتا ہوں۔ یہ ادارے سیرت کے حوالے سے اپنے اپنے ممالک میں رائج زبانوں میں لکھی جانے والی کتب مجھے ارسال کرتے ہیں۔ کچھ پبلشرز سے میں نے معاہدے کیے ہوئے ہیں۔ ان معاہدوں کے تحت وہ سیرت کی کتب مجھے کم داموں میں فروخت کرتے ہیں۔ کچھ سرکاری اعزازی کتب بھی ارسال کرتے ہیں۔ میری پوری تنخواہ اور زرعی زمین سے حاصل ہونے والی آمدن ان کتب کی خریداری پر خرچ ہوتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا پیسہ ضایع نہیں ہو رہا۔ یہ سب سے بڑی Investment ہے۔"

یہ بتا کر پروفیسر بخاری مسکرانے لگتے ہیں۔ ان کے پرنور چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ ان کی آنکھوں سے علم و دانش کی روشنی پھوٹنے لگتی ہے۔

سیرت لائبریری شہداد کوٹ میں موجود کتب نہایت

خوبصورت ترتیب اور سلیقے سے رکھی گئی ہیں۔ تمام خانوں یا شیلف پر نمبر لگائے گئے ہیں، تاکہ مطلوبہ کتب ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس کے علاوہ کتب کو محفوظ رکھنے کے جدید انتظامات کیے گئے ہیں۔ ساری کتب کو فیومی گیشن چیمبرز (Fumigation Chambers) میں رکھا گیا ہے، تاکہ کتب کو کیڑا نہ لگ سکے اور کاغذ بھی گلنے سے بچ جائے۔

سیرت لائبریری میں ہزاروں نایاب کتب تلاش کر کے رکھی گئی ہیں، مثلاً شرح السنہ، جامع السنہ، فتاویٰ رضویہ، فتاویٰ عالمگیری، صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی، سنن ابی داؤد، شرح صحیح بخاری، شرح صحیح مسلم، شرح فتح القدیر، شرح سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، شرح العینی، فتاویٰ محمودیہ، جمع الجوامع، جامع الاحادیث، ریاض الاشراف مجمع الزوائد، جامع الاصول، البدر المنیر، المصنف، فتح الباری الموسوعت الفقہیہ، بدایع الصنایع، بحار الانوار، وسائل الشیعہ، کشف الظنون اور اشراف الہدایہ۔ ان ساری کتب کو دیکھنا بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔

سیرت لائبریری میں قرآن پاک کی تفاسیر بھی بہت بڑی تعداد میں اور بہت اہتمام سے رکھی گئی ہیں۔ سیرت پاک اور احادیث کی کتب بھی اس لائبریری میں بڑی حفاظت سے رکھی گئی ہیں۔

اردو میں بھی سیرت، احادیث، صحابہ کرام، غالبیات، اقبالیات اور دیگر ادبی موضوعات پر لکھی ہوئی کتب کا ایک بہت بڑی ذخیرہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے سندھی زبان میں لطیفیات، قدیم وجدید سندھی ادب و شاعری تاریخ سندھ وغیرہ پر کتب اس شاندار کتب خانے میں رکھی گئی ہیں۔

سیرت لائبریری میں ویسے تو کئی ضخیم کتب موجود ہیں، لیکن ان سب میں سے ضخامت کے لحاظ سے سب سے بڑی کتاب 'تاریخ دمشق' ہے، جو ۸۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں پورے پاکستان سے محقق یہاں آتے ہیں۔ قرآنیات، سیرت، فقہ، اسلامی تاریخ اور کئی ایک موضوعات پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے کئی طلبہ اس لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور کئی یورپی، ایشیائی اور عرب ممالک کے اسکالرز اپنے تحقیقی کام کے ضمن میں اس لائبریری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سیرت لائبریری علم و دانش کی ایک حیران کن دنیا ہے۔ یہ ایک ایسی علامت ہے، جہاں سے حکمت، دانائی اور شعور کی کئی ایک راہیں نکلتی ہیں اور یقیناً یہ راہیں روشن ہی ہیں۔

☆.....☆

انگوٹھی ڈھونڈنے میں مدد کریں

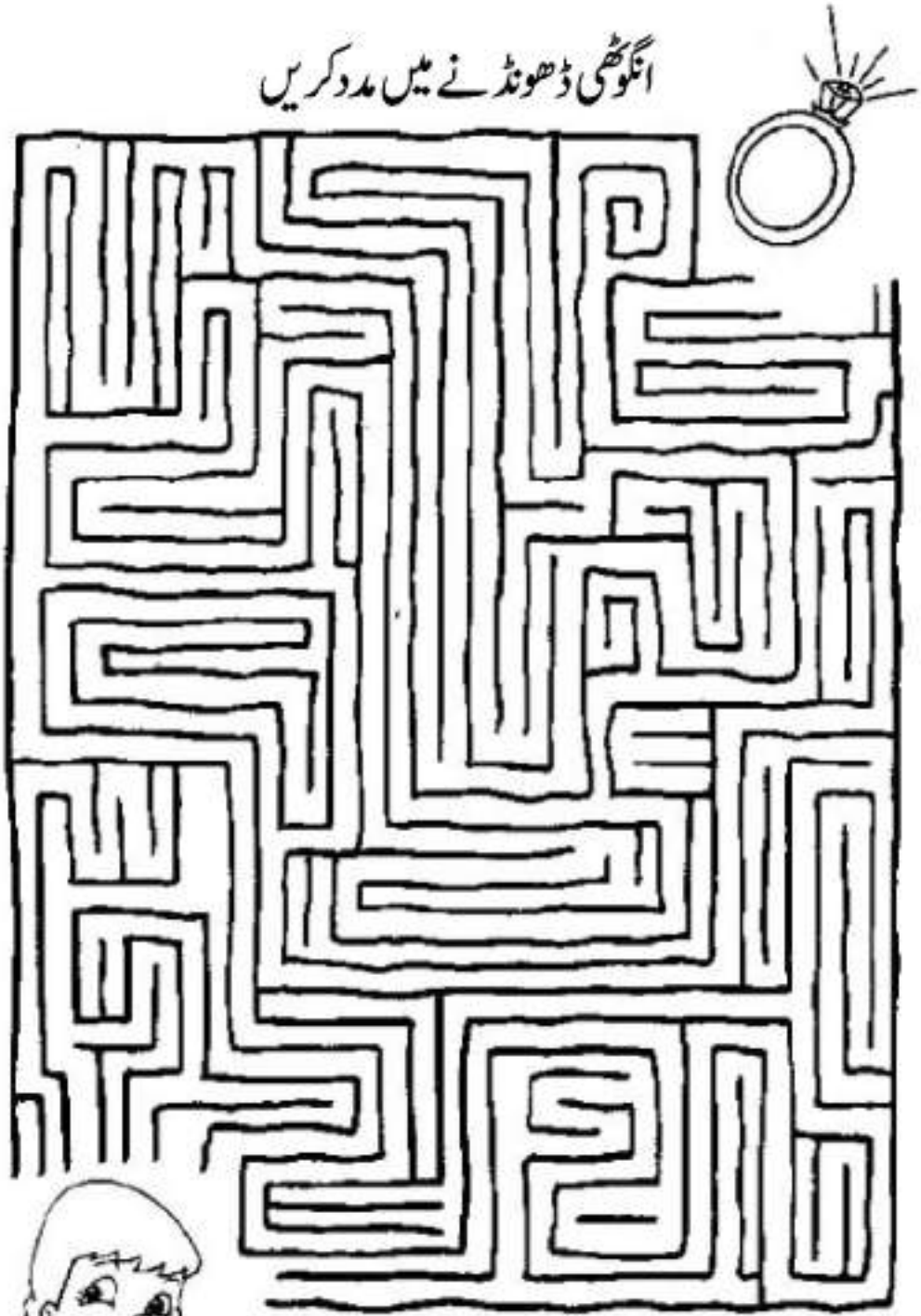

آمنہ کی انگوٹھی گم ہوگئی ہے کیا آپ آمنہ کی انگوٹھی ڈھونڈنے میں مدد کریں

قارئین ساتھی کے حسِ مزاح کو جانچنے کے لیے ماہنامہ ساتھی نے شروع کیا ہے۔ ان کے لیے ایک انعامی سلسلہ۔ جس میں ہر ماہ بہترین اور دلچسپی سے بھرپور لطیفے بھیجنے والے قارئین ساتھی کو **ڈیئر پنسل** اور بال پین بنانے والے ادارے **انڈس پنسل انڈسٹریز** کی جانب سے دیا جائے گا خوبصورت تحفہ — تو پھر قلم سنبھالیے اور مزاح کے اس دوڑ میں شامل ہو جائیں...... جہاں "ذرا کھلکھلائیے" آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

نوٹ: لطیفہ روانہ کرتے ہوئے اس پر اپنا نام، مکمل پتا اور فون نمبر لکھنا مت بھولیے گا۔

DEER PENCIL

کلاس

پروفیسر صاحب نے کلاس میں پیچھے کھڑے ایک لڑکے سے سوال کیا: "نیوٹن نے لا آف گریوٹی کب پیش کیا تھا"۔

لڑکا: "مجھے نہیں معلوم سر۔"

پروفیسر (ناگواری سے): "اچھا یہ بتاؤ زمین سورج سے کتنے نوری فاصلے پر ہے؟"

لڑکا: میں نہیں جانتا سر۔"

پروفیسر صاحب (غصے میں): اچھا یہ بتاؤ نظر اصناف کسے کہتے ہیں؟"

لڑکا: "مجھے نہیں معلوم۔"

پروفیسر صاحب: "خدا کی پناہ تمھیں فزکس کی بنیادی باتیں ہی معلوم نہیں، پرائمری کا بچہ بھی ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہے۔"

لڑکا (بیزاری سے): ''میرا فزکس سے کیا تعلق جناب! میں الیکٹریشن ہوں، اس کمرے کا پنکھا ٹھیک کرنے آیا ہوں۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆.....☆

مداری

انعامی لطیفہ

ایک مداری لوگوں کو اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ اس نے کہا: ''میں ہاتھوں کا استعمال کیے بغیر انڈا توڑ سکتا ہوں۔''

لوگوں نے کہا: ''انڈا توڑ کر دکھاؤ۔''

مداری نے پاؤں سے انڈا توڑ دیا۔

مرسلہ: ہارون آغا، جامعہ نعمان

☆.....☆

پچھلا دروازہ

ایک کرایہ دار پر کئی ماہ کا کرایہ واجب تھا۔ بلڈنگ کے مالک کا کارندہ جب اس کے پاس تقاضا کرنے کو پہنچا تو اس نے کچھ روپے اسے دے کر کہا: ''انھیں میرے حساب میں جمع کر دیں۔''

کارندہ روپے گن کر بولا: ''آپ یقیناً اس سے زیادہ بھی دے سکتے تھے۔''

کرایہ دار بولا: ''بالکل نہیں جناب، اس سے زیادہ فی الحال میں ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا اور اگر میں پچھلا دروازہ کباڑیے کے ہاتھ فروخت نہ کرتا تو آپ کو اتنے روپے بھی نہیں ملتے۔''

مرسلہ: ناہید ضمیر حسین، کراچی

☆.....☆

ابالنا

ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے اُبال لیا کریں۔''

آدمی: ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اُبالنے سے بچہ مرے گا تو نہیں۔''

مرسلہ: جویریہ حبیب الرحمٰن، کراچی

☆.....☆

تنقید

ایک ریٹائرڈ آفیسر کو اپنی بیوی کے ہر کام میں نقص نکالنے کی عادت تھی۔ اگر وہ انڈہ اُبالتی تو وہ کہتا کہ اسے فرائی کرنا تھا اور اگر فرائی کرتی تو کہتا کہ انڈہ اُبالا کیوں نہیں۔ ایک دن تنگ آ کر اُس کی بیوی نے دونوں طرح کے انڈے بنائے۔ آفیسر نے کافی دیر انڈوں کو دیکھا پھر کہنے لگا: ''تمھیں عقل کب آئے گی، جس انڈے کو اُبالنا تھا اسے فرائی کر لیا اور جسے فرائی کرنا تھا اسے اُبال لیا۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆.....☆

کشتی

دو چیونٹیوں میں سے ایک نے ہاتھی سے۔ ''کیوں بھائی ہم سے کشتی کرو گے؟''

دوسری چیونٹی بولی: ''بے چارہ اکیلا ہے اور ہم دو ہیں۔''

مرسلہ: محمد عمر بن عبدالرشید، کراچی

☆.....☆

بلی ہوں

انعامی لطیفہ

ایک چور کسی کے گھر چوری کی نیت سے داخل ہوا اور مالک مکان کے تکیے کے نیچے سے چابیاں تلاش کرنے لگا۔ اسی اثناء میں مالک مکان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔

مالک مکان نے پوچھا: ''کون ہے۔''

چور نے منہ سے بلی کی آواز نکالی کہا: ''میاؤں میاؤں۔''

مالک نے پھر پوچھا: ''کون ہے؟''

چور نے پھر بلی کی آواز نکالی: ''میاؤں میاؤں۔''

مالک نے پھر غصے سے پوچھا: ''میں پوچھتا ہوں کون ہے؟''

چور نے بھی غصے سے جواب دیا: ''کتنی بار بتاؤں بلی ہوں؟''

مرسلہ: مرزا حمزہ بیگ، کراچی

☆.....☆

لگتا ہے

ایک آدمی نے پہلی بار روزہ رکھا۔ عصر کے وقت اپنے بیٹے سے پوچھا: ''دیکھو بیٹا سورج ڈوبا یا نہیں؟''

بیٹا: ''جی نہیں۔''

تھوڑی دیر بعد باپ نے پھر یہی پوچھا: ''بیٹا سورج ڈوب گیا کیا؟''

بیٹا: ''نہیں ابو ابھی نہیں ڈوبا۔''

باپ: ''بس تو پھر لگتا ہے مجھے لے کر ہی ڈوبے گا۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆.....☆

گھوڑا گر گیا

ایک دیہاتی اور انگریز فلم دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں فلم کا ہیرو آیا وہ ایک سرپٹ گھوڑے پر سوار تھا۔

انگریز نے کہا: ''یہ گر جائے گا۔''

دیہاتی نے کہا: ''نہیں یہ تمھارا وہم ہے یہ کبھی نہیں گرے گا۔''

دونوں میں شرط لگ گئی، تھوڑی دیر بعد ہیرو گھوڑے سے گر گیا۔

انگریز نے کہا: ''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ یہ گر جائے گا۔''

دیہاتی: ''کل جب میں نے یہ فلم دیکھی تو یہ اس میں گر گیا تھا، میں یہ سمجھا کہ ہیرو اب تھوڑا احتیاط ہو کر گھوڑا دوڑائے گا۔''

مرسلہ: طیبہ فاطمہ، کراچی

☆.....☆

مچھر نے کاٹ کھایا

ارسلان اللہ خان

مچھروں نے کاٹ کھایا ہے مجھے
خوب ہی لوگو ستایا ہے مجھے

بھنبھناہٹ کی ہے میرے کان پر
اس طرح گانا سنایا ہے مجھے

خون چوسا ہے دھڑلے سے مرا
دیکھیے کیسے جلایا ہے مجھے

جاگتے ہیں جس طرح ایگزام میں
مچھروں نے یوں جگایا ہے مجھے

مچھروں کی آپ قسمت دیکھیے
کیسے کم بختوں نے پایا ہے مجھے

جیسے اٹھتے ہیں بھیانک خواب سے
یوں اچانک ہی اُٹھایا ہے مجھے

تلخیاں جس کی دوڑے بن گئیں
گھونٹ کچھ ایسا پلایا ہے مجھے

گھاؤ جس کا ایک ہفتے تک رہے
زخم وہ کاری لگایا ہے مجھے

کوائل کمرے میں لگاؤ تم ضرور
میری امی نے بتایا ہے مجھے

ارسلاں دیکھو یہ مچھر ہے فقط
اس قدر جس نے رلایا ہے مجھے

ٹوتھ پیسٹ کا معما

انوشہ سروپ

آخر ٹوتھ پیسٹ کون غائب کر رہا تھا؟.....

دسمبر کی ایک صبح جب عبداللہ صاحب منھ دھونے واش بیسن کے پاس پہنچے تو ان کی گرجدار آواز سے سبھی گھر والے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچن سے شائستہ بیگم کی آواز آئی۔

''ارے اب کیا ہوا جی.....؟ کیوں صبح صبح چلا رہے ہیں.....؟''

عبداللہ صاحب: بیگم اب بس بہت ہو گیا۔ بھئی یہ تو حد ہی ہو گئی۔ اب اس معاملے کو حل کرنا ہی پڑے گا۔

اب میری جیب، اور برداشت دونوں کی حد ہو چکی ہے۔ یہ اس مہینے کی دسویں منجن تھی۔

منجن نہیں ابو ٹوتھ پیسٹ (ان کے چھوٹے بیٹے نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا) جو اسکول جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔

عبداللہ: ہاں ہاں..... وہی ٹوتھ پیسٹ..... آج پھر غائب ہے.....؟

آخر تم لوگ اس کا کرتے کیا ہو.....؟ پتہ ہے ایک ٹوتھ

پیسٹ کتنے کی آتی ہے.....؟

علی رضا بلاؤ اپنے بھائی ، بہن کو اور سب صحن میں کھڑے ہوجاؤ..... عبداللہ صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے سے مخاطب ہوکر کہا۔

کچھ ہی دیر میں علی رضا اپنے بڑے بھائی عاصل اور بہن عائشہ کے ساتھ صحن میں آ گیا۔ یہاں عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔

جس میں وکیل اور جج عبداللہ صاحب تھے۔

ہاں تو..... سچ سچ بتاؤ..... کہاں گیا.....؟ ٹوتھ پیسٹ جو میں ایک ہفتے پہلے ہی لایا تھا۔'' انھوں نے سوالیہ نظروں سے اپنے تینوں بچوں کی طرف دیکھا۔

صحن میں خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کچن سے شائستہ بیگم کی آواز آئی جس نے گھر میں چھائی خاموشی کو یکدم توڑ دیا۔

ارے..... یہ..... کیا پنچائت لگائی ہوئی ہے۔ صبح صبح.....تم لوگوں کو اسکول نہیں جانا کیا.....؟ اور آپ بھی جلدی کریں۔ ورنہ دفتر کے لیے دیر ہوجائے گی.....اور ویسے بھی ناشتہ کب سے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

یہ سن کر عبداللہ بولے۔ چلو سب سے پہلے ناشتہ کرلو۔ یہ مت سمجھنا کہ معاملہ یہیں رفع دفع ہوگیا۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ کون ہے جو ہر ہفتے میرے ۱۵۰ روپے کا نقصان کراتا ہے۔

ابھی انھوں نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ میز پر ناشتہ لگاتی ہوئی شائستہ بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر کر ٹوٹ گیا۔

اب یہ کیا.....؟ دو ہزار روپے کا ٹی سیٹ تھا۔ جس کا کپ تم نے توڑ دیا۔ اوپر سے چائے کا نقصان بھی۔ تم لوگ ایک دن مجھے سڑک پر لا کر چھوڑو گے۔ انھوں نے ناراضگی ظاہر کی۔ اور جلدی جلدی ناشتہ کر کے دفتر کے لیے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد تینوں بہن بھائی اپنے اپنے بستے اٹھا کر اسکول کے لیے روانہ ہوگئے۔ شائستہ بیگم اپنے گھریلو کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

ان کے چھوٹے بیٹے علی رضا کو جاسوسی میں بڑی دلچسپی تھی۔ علی رضا ابھی صرف تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ جو اپنی عمر کے مقابلے میں کافی عقل مند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ علی رضا خود کو جاسوس سمجھتا تھا اور ہر بات کی جاسوسی کرتا تھا..... اس کا جاسوسی کا شوق پہلے تو صرف ڈرامے دیکھ کر ہی پورا ہوجاتا تھا۔ لیکن اب اس کا یہ شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب وہ خود کو بھی انہی کا ایک کردار سمجھتا تھا۔

یہ ایجنٹ اب تک اپنے تین کیس حل کر چکا تھا۔ جن میں سے ایک کیس اس کی اپنی پینسل کا تھا۔ جو اس کے ہی ایک ہم جماعت نے چرائی تھی۔ اپنے اس کیس کی کامیابی پر اسے بہت خوشی ہوئی اور ساتھ ہی

اس کے شوق میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کے باقی دونوں کیس بھی اسکول تک ہی محدود تھے۔

اسے اب ایک اور کیس مل گیا تھا اور یہ گھر میں اس کا پہلا کیس تھا اور وہ اپنے طور پر اس کیس کی جاسوسی شروع کر چکا تھا۔

وہ ہر روز غائب ہوئے ٹوتھ پیسٹ کے بارے میں سوچتا اور اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خفیہ طریقے سے سب کے کمروں کی تلاشی لیتا اور واش بیسن کے آس پاس نگرانی کرتا اور گھر کے ہر فرد پر کڑی نظر رکھتا۔ لیکن اب تک اس کے ہاتھ کوئی ثبوت نہیں آیا تھا۔ اسکول جاتے وقت راستے میں بھی اس کے دماغ میں آج کی غائب ہونے والی ٹوتھ پیسٹ چل رہی تھی۔ وہ یہی سوچتے ہوئے قدم بڑھا رہا تھا۔

یوں تو دن بدن غائب ہو جانے والی ٹوتھ پیسٹ کا یہ واقعہ سب کے ذہنوں پر سوار تھا۔ لیکن اس واقعے کے بارے میں سب اپنے اپنے طریقوں سے سوچ رہے تھے۔

ایک طرف علی رضا تھا جو اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔ وہیں دوسری طرف اس کا بڑا بھائی عاصل جو ڈراؤنی کہانیوں اور فلموں میں دلچسپی رکھتا تھا اور ہر بات میں جن بھوتوں کا ہاتھ سمجھتا تھا۔ اس معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی سوچ رکھتا تھا۔

اس بار بھی وہ ٹوتھ پیسٹ کے غائب ہونے کے پیچھے بھی جھوٹ بلا کا ہاتھ سمجھ رہا تھا۔

اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی یہی سمجھانے کی کوششوں میں لگا تھا۔

کسی اور کو اس کی باتوں پر یقین آتا یا نہیں..... لیکن شائستہ بیگم کو تو اپنے بیٹے کی ان باتوں پر بہت جلد یقین ہو جاتا تھا۔ انھوں نے عبداللہ صاحب کو بھی ان باتوں پر یقین دلانے کی کوششیں کیں۔

اب گھر میں عاصل کی ان باتوں کا اثر کچھ یوں ہوا کہ سب ہی سوچنے لگے کہ ان واقعات کے پیچھے ضرور کسی جن صاحب کا ہاتھ ہے۔

جو گھر میں سے ٹوتھ پیسٹ غائب کر کے شاید اپنے بچوں کے دانتوں کی حفاظت فرماتے ہیں۔

گھر سے ٹوتھ پیسٹ غائب ہونے کا سلسلہ تو اب بھی جاری تھا۔ مگر اب فرق صرف اتنا تھا کہ عبداللہ صاحب نے اس بات پر اپنے بچوں کی کلاس لینا چھوڑ دی تھی۔

اب ہر روز بچوں کو مجرموں کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہونے سے نجات مل گئی تھی۔

لیکن اب انھیں صرف اپنے جیب کے خالی ہونے کا غم ستا رہا تھا اور انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ تعالیٰ انھیں ان کی کنجوسی کی سزا دے رہے ہیں۔ اس بات سے سب گھر والے بہت پریشان رہتے اور اس جن سے کسی بھی طرح چھٹکارہ پانے کی ترکیب سوچتے رہتے۔

یہاں ایک طرف سب گھر والے ان واقعات کا قصور وار ''جن'' کو سمجھتے تھے اور دوسری طرف علی رضا روزانہ ان واقعات کی تحقیق میں لگا رہتا۔

آخر سردیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ اب تو علی رضا کا پورا دھیان اس گتھی کو سلجھانے میں لگا رہتا۔ اب تک اسے ناکامی کا سامنا تھا۔

یہ گیارہویں ٹوتھ پیسٹ تھی جو غائب ہوچکی تھی اور بارہویں ٹوتھ پیسٹ اب تک صحیح سلامت تھی۔ علی رضا کی مکمل توجہ اس پر تھی۔ وہ ہر وقت واش بیسن کے آس پاس ہی رہتا۔ اس بار اسے پورا یقین تھا کہ وہ ٹوتھ پیسٹ غائب کرنے والے کا پردہ فاش کر کے ہی دم لے گا۔ آخر پھر وہ وقت آ ہی گیا۔ جس کا اسے بے صبری سے انتظار تھا۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر کے سبھی افراد گہری نیند میں تھے۔ مگر علی رضا اب بھی جاگ رہا تھا اور بڑی بے چینی سے چور کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ کوئی انسان ہے یا جن۔ اسی کشمکش میں وہ اپنی نیند قربان کر کے بستر پر دو گاؤ تکیے رکھ کر اس پر کمبل ڈال کر صوفے کے نیچے سے بیسن پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

تب ہی کسی کے قدموں کی آہٹ نے علی رضا کو کسی فوجی کی طرح الرٹ کر دیا۔ وہ چوکنا ہوگیا اور اس کی ساری توجہ چور کی طرف مبذول ہوگئی۔

رزاق

ایک مسافر تھکا ہارا رات کو کسی گاؤں کی مسجد میں پہنچا۔ امام صاحب موجود تھے۔ مسافر نے ان سے کھانا طلب کیا تو امام صاحب نے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھی۔

مسافر بولا: ''بخدا میری عمر ۸۰ سال ہے میرے خدا نے آج تک رزق دینے سے پہلے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے نماز پڑھی یا نہیں؟''

مرسلہ: مرزا حمزہ بیگ، حیدرآباد

جب وہ قدم بیسن کی طرف بڑھے تو آخر کار علی رضا کی نظر اس چور پر پڑ ہی گئی جس کا وہ بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔

یہ جان کر وہ کافی حیران ہوا کہ وہ ''جن'' اس کی اپنی بہن عائشہ تھی۔ اپنے طور پر وہ یہ کیس حل کر چکا تھا۔ لیکن ایک سوال اب بھی اس ذہن میں گھوم رہا تھا۔ وہ یہ کہ عائشہ آپی آخر اس کا کرتی کیا ہیں.....؟

اسی سوال کا جواب جاننے کے لیے اس نے عائشہ آپی کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ عائشہ کے قدم اسٹور روم کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ علی رضا سے رہا نہ گیا اور وہ سیدھا کھڑکی کی جانب بڑھا اور بڑی بے تابی سے اندر

جھانکا تو دیکھا کہ عائشہ اندر بیٹھی ٹوتھ پیسٹ ایسے کھا رہی ہے جیسے کوئی مزیدار سی آئس کریم ہو..... یہ منظر دیکھ کر اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ عائشہ اسے یہاں اچانک دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی علی رضا نے کہنا شروع کیا۔

''آخر میں نے آپ کو پکڑ ہی لیا ناں..... ابھی سب کو بتاتا ہوں.....'' وہ اپنے اس کارنامے پر سینہ پھلا کر بولا۔

عائشہ: رکو علی..... نہیں.....

علی رضا: کیوں کیوں.....؟ آخر آپ پکڑی ہی گئیں۔ اچھا آپ مجھے بس اتنا بتا دیں کہ آپ یہ کھاتی کیوں ہیں۔ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے.....؟

عائشہ: کیا کروں؟ علی یہ کھائے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔ تمھیں یاد ہے جب ابو پہلی بار یہ مزے دار فلیور والی ٹوتھ پیسٹ لائے تھے۔ مجھے تو یہ تب ہی سے پسند ہے اور اب تو مجھے یہ فلیور میں اچھی لگتی ہے۔ اب تو یہ میری عادت بن گئی ہے۔

علی رضا: لیکن عائشہ آپی یہ اچھی عادت نہیں ہے۔ اگر آپ مجھ سے اسے نہ کھانے کا وعدہ کریں تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا.....

عائشہ: نہیں بالکل نہیں علی..... اب چاہے تم کچھ بھی کہو میں نہیں ہٹ سکتی۔ اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

علی رضا: تو ٹھیک ہے آپی۔ میں ابھی سب کو بتاتا ہوں۔

ابو.....!! ابو.....!! علی رضا نے چلانا شروع کیا۔ آپی عائشہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

اتنے میں سب علی رضا کے پاس پہنچے۔

عبداللہ: کیا ہوا بیٹا.....؟ کیوں چلا رہے ہو.....؟

علی رضا: ابو..... وہ..... ٹوتھ پیسٹ..... وہ..... ٹوتھ پیسٹ..... وہ.....

عاصل: بابا جانی لگتا ہے اس نے اسی 'جن' کو دیکھ لیا ہے۔ جب ہی کچھ بول نہیں پا رہا ہے..... ہے ناں..... علی

علی رضا: نہیں بھائی کوئی بھی جن نہیں ہے..... عائشہ آپی ہیں۔

اس سب کے پیچھے۔

عاصل: لیکن چھوٹی تو سو رہی ہے..... تم نے ضرور کسی چڑیل کو دیکھا ہوگا۔

علی رضا: نہیں بھائی..... میرا یقین کریں۔ وہ آپی ہی تھیں۔

اور وہ سو نہیں رہی ہیں۔

عبداللہ: بس کرو علی..... ایک دوسرے کو الزام دینا بند کرو۔

اسی وقت شائستہ بیگم بولیں: میں تو کہتی ہوں جی! اب ہمیں ڈنڈے والے بابا کو بلا لینا چاہیے۔

عادت سے مجبور

لندن میں کئی سال گزارنے کے بعد جب حسن وطن واپس لوٹا تو اپنے استاد سے بھی ملنے گیا۔

استاد نے پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا: ''کہو بیٹا کیا حال ہے؟ خوش تو ہو؟ نوکری ملی یا نہیں؟ کب تک رہو گے؟ واپسی کا ارادہ ہے یا مستقل رہو گے؟ تعلیم مکمل ہو گئی تمھاری؟''

حسن نے کہا: '' آپ نے تو ایک ہی وقت میں اتنے سارے سوال پوچھ لیے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا آپ چھ میں سے کوئی تین سوالات کے جوابات دے دیں البتہ آخری سوال لازمی ہے۔''

مرسلہ: حافظ محمد ارقم، حیدر آباد

عبداللہ: ڈنڈے والے بابا.....وہ کون ہیں.....؟

شائستہ بیگم: وہ کل اپنی پڑوسن کائنات بی بی کو فتے دینے آئی تھیں ناں.....انھوں نے ہی بتایا تھا۔ اصل میں ان کے گھر بھی پرسوں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ ان کے گھر میں ایک کالی بلی جانے کہاں سے گھس آئی اور ان کی دو تین مرغیاں چٹ کر گئی اور پتہ ہے ان کے گھر کے سارے دروازے بند تھے۔

یہ سن کر ماحول میں کچھ خوف سا چھا گیا.....پھر انھوں نے آگے بتانا شروع کیا۔

کائنات کے شوہر کے ایک دوست نے انھیں ڈنڈے والے بابا کا پتا بتایا اور انھوں نے بلا لیا۔ وہ ان کے گھر پر کچھ تعویز اور دم کر کے گئے ہیں۔ تب سے وہ کالی بلی نظر ہی نہیں آئی اور ڈنڈے والے بابا نے انھیں بتایا تھا کہ اس محلے پر جن کا سایہ ہے۔ جو روپ بدل بدل کر آتا ہے۔

میں تو کہتی ہوں ہم بھی دم یا تعویذ کروا ہی لیتے ہیں۔

عبداللہ: تم ٹھیک کہتی ہو بیگم! ہم بھی دم کروا ہی لیتے ہیں۔

اس روز روز کے خرچے سے میری جان تو چھوٹے گی۔ ایسا کرو کل اسے بلوا ہی لو۔

اگلے ہی دن رنگ برنگے پیوند لگے۔ عجیب و غریب چولے میں ملبوس۔ گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی رنگ برنگی مالا پہنے۔ انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں، ایک ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا۔ جس پر مختلف رنگوں سے گلکاری کی ہوئی تھی اور اوپر گھنگھرو بندھے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں لوبانی کی دھونی لیے۔ بڑے شاہانہ انداز میں گھر کے دروازے سے بابا اندر داخل ہوا اور گھر پر چاروں طرف اپنی پراسرار نظر دوڑائی جیسے 'جن' تلاش کر رہا ہو۔

اور حق کی بلند آواز کے ساتھ ڈنڈا اس زور سے زمین پر مارا کہ سب کے دل دہل گئے۔ یوں لگا جیسے 'جن' کا سر ان کے ڈنڈے تلے آ گیا ہو۔

اب بچ کر کہاں جائے گا.....؟ ۲۰،۰۰۰ روپے کا خرچہ ہے وظائف پڑھنے پڑیں گے۔

ان کی یہ بات سن کر سب حیرانی سے ڈنڈا بابا کی طرف

دیکھنے لگے۔

اس ڈنڈے والے بابا سے تو کوئی انڈے بھی نہ خریدے۔علی رضا نے دل ہی دل میں خود سے کہا.....

ڈنڈا بابا نے پھر کہا جلدی کرو بچہ.....

میرا وقت بہت قیمتی ہے.....

اور شان بے نیازی سے واپسی کے لیے پلٹا.....

شائستہ بیگم نے جلدی سے روکا.....اچھا اچھا ہم رقم کا بندوبست کرتے ہیں۔''

بس آپ 'جن' کو پکڑ لیں.....کہیں وہ اور نقصان نہ کردے.....

آخر ڈنڈا بابا ۲۰،۰۰۰ روپے لے کر اور اپنے طور پر 'جن' کو بھگا کر چلا گیا۔

اس قصے کے بعد جب ٹوتھ پیسٹ غائب ہوئی تو سب بہت پریشان ہوئے اور دوبارہ ڈنڈا بابا کے پاس جا پہنچے۔

مگر یہ کیا.....اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔جب بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی وہ اس دھرتی پہ نہ ملا تو خود ہی دل کو سمجھا لیا کہ اللہ والا ہے۔کہیں چلہ کاٹ رہا ہوگا۔یا پھر کہیں اور 'جن' بھگانے گیا ہوگا۔

ان سب کی آنکھوں پر اس کی پراسرار شخصیت کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ اس کا فراڈ نظر ہی نہیں آیا۔

علی رضا نے سب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔

وقت گزرتا گیا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا کہ ایک دن اچانک عائشہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔اس کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا۔گھر والے اسے لے کر ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیا کہ عائشہ کی بیماری کی وجہ ٹوتھ پیسٹ ہے اور وہ کافی عرصہ سے اس کا استعمال کر رہی ہے۔جس کی وجہ سے اس کی آنتوں میں انفیکشن ہوگیا ہے۔

اب سب گھر والوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ علی رضا سچ کہہ رہا تھا۔اگر وہ اس کی بات پہلے ہی مان لیتے۔اسے چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہ کرتے۔تو عائشہ کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ سب اپنی اس بے وقوفی پر بھی نادم تھے جو ڈنڈے والے بابا پر اتنا اعتماد کیا۔

عائشہ کو اس قدر درد برداشت کرنا پڑا کہ ان نے بھی اپنی اس حرکت سے توبہ کرلی۔

علی رضا نے اس کیس کے علاوہ کائنات آنٹی کے گھر پر پیش آنے والے اس بلی والے کیس کو بھی حل کرلیا تھا کہ کائنات آنٹی کے گھر کے برآمدے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔جس کی وجہ سے بلی ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔وہ ان دونوں واقعات کی گتھی سلجھا کر خاصا خوش تھا اور گھر والوں نے بھی اس کی ذہانت کو تسلیم کرلیا تھا۔

☆.....☆

حمدِ ربِ جلیل

ضیاءُالحسن ضیاؔ

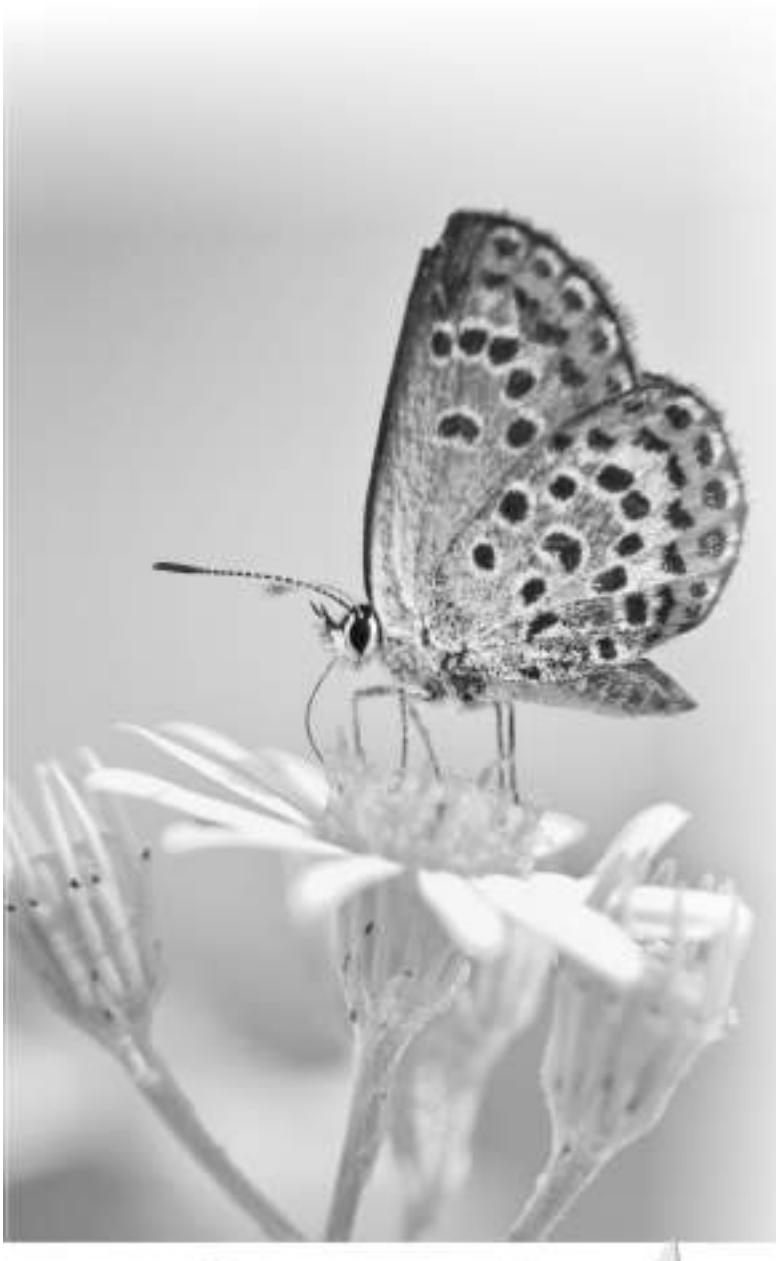

حمدِ ربِ جلال
اے رب کُل عالموں کے
اب فضل ہم پہ فرما
صد ہا بلائیں ہم کو
گھیرے ہوئے ہیں مولا
ان سے ہمیں چھڑادے
تو اپنا فضل فرما
بھٹکے ہوئے ہیں راہی
سیدھا جو راستہ ہے
ہم کو وہی دکھا دے
راہِ فلاح ہے جو
اس راہ کو جو بھولے
محروم ہیں وہ تیرے
انعام سے سراسر
گمراہیوں سے یکسر
ہم کو پناہ دیدے
وہ راستہ دکھا دے
جو تیرا راستہ ہے

فرحت شمیم

بلوچستان کے پہاڑ کوہ شاشان کو بلوچستان کے سب سے بڑے کھڑے چٹریلے پہاڑ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بلوچستان کے ضلع خضدار میں واقع خضدار میں واقع اس پہاڑ پر قدرت کے دل چسپ عجائبات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ نرم زمین پر درخت کا پنپنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر قوی ہیکل سنگی چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلنے والے پاپی رس (Papy Rus) کے پیڑوں کو دیکھ کر آپ یقیناً دنگ رہ جائیں گے۔ یہ دنیا کے ان چند گنے چنے پہاڑوں میں سے ایک ہے جس پر برف بہت کم یعنی دس سال میں ایک آدھ باری پڑتی ہے۔

یہ عجوبہ مچھلی کیٹ آئی (Cat Eye) ہے جو آسٹریلیا کے گریٹ ریف ساحل کی ۵۰ فٹ گہرائی میں ملتی ہے۔ دیگر مچھلیوں کی طرح اس کے گلپھڑے کے گردن کے مقام پر نہیں بلکہ اس ننھی منی مچھلی کے منہ میں ہوتے ہیں۔ تصویر میں یہ اپنا جبڑا کھول کر نمائش کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس مچھلی کے منہ میں دانت نہیں ہوتے۔ یہ غذا کو چوس کر اپنا گزر بسر کر لیتی ہے۔ یہ مچھلی چاندنی راتوں میں ہی انڈے دیتی ہے جن کی تعداد ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ تک ہوسکتی ہے۔

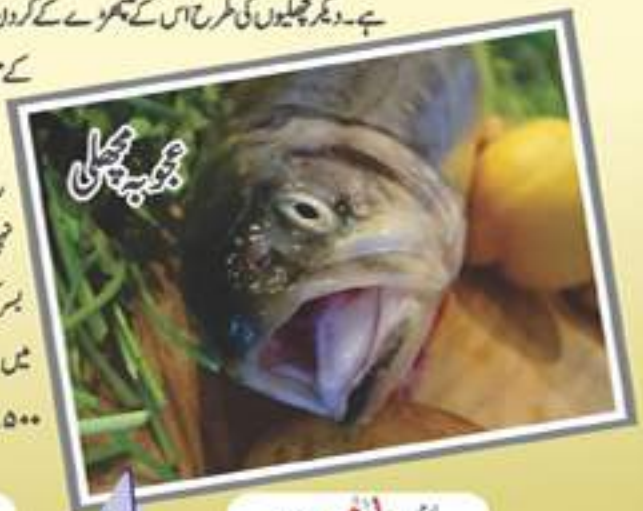

جادوئی آب خورہ

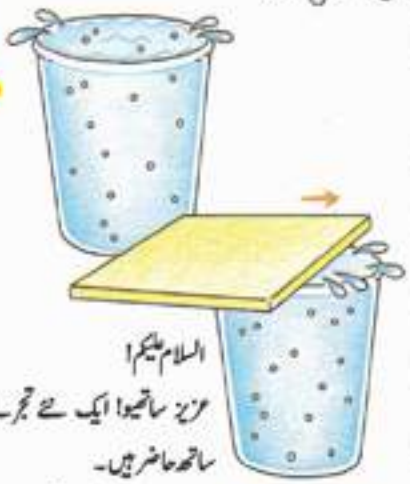

تجربے کے دوران ان اشیا کی ضرورت پڑے گی:

☆آب خورہ (گلاس)

☆پانی

☆ایک سکہ

السلام علیکم!

عزیز ساتھیو! ایک نئے تجربے کے ساتھ حاضر ہیں۔

عزیز ساتھیو! سب سے پہلے آب خورے کو پانی سے لبالب بھرلیں۔ گتے کو آب خورے کے اوپر دبا کر رکھیں۔ آب خورے کو ایک ہاتھ میں اٹھائیں اور دوسرے ہاتھ کو گتے کے اوپر رکھیں۔ بہت احتیاط سے آب خورے کو الٹ دیں۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ گتے کے نیچے سے ہٹالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ گتے نے پانی کو نیچے جانے سے روک رکھا ہے۔ (گتا بھی آب خورے کے ساتھ ہی رہا)۔

ایسا کیوں ہوا؟

پانی آب خورے میں اس لیے رُکا رہا کیونکہ پانی اور گتے کے درمیان ہوا کا دباؤ بہت کم ہے۔ جبکہ آب خورے کے باہر والی ہوا کا دباؤ زیادہ ہے جس نے گتے کو گرنے سے روک رکھا ہے۔ ہوا کا دباؤ بہت مضبوط ہوتا ہے۔

آب خورہ لبالب بھرے ہونے کے باعث ہوا کو اندر جگہ نہ مل سکی۔

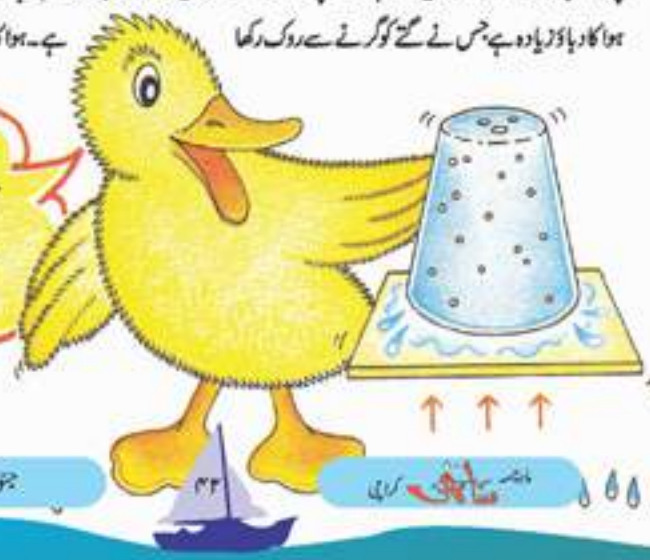

یہ بھی دنیا ہے

بستروں کی تعداد

سوویت یونین میں ہر سو افراد کے لیے ہسپتال میں ایک بید مختص ہے۔ بستروں کی کل تعداد تقریباً پچیس لاکھ ہے۔ نائجیریا میں پچیس سو لوگوں کے لیے صرف ایک بستر مختص ہے اور تمام بستروں کی تعداد صرف پینتیس ہزار ہے۔

دنیا کی آمدنی

دنیا کی آدھی آبادی (یعنی غریب لوگ) جتنی دولت کماتے ہیں وہ دنیا کی کل دولت کا صرف پانچ فیصد ہے اور دنیا کے پندرہ فیصد امیر ترین لوگ جو دولت کماتے ہیں وہ دنیا کی کل دولت کا دو تہائی حصہ بنتا ہے۔ ہے ناں حیرت کی بات.....!

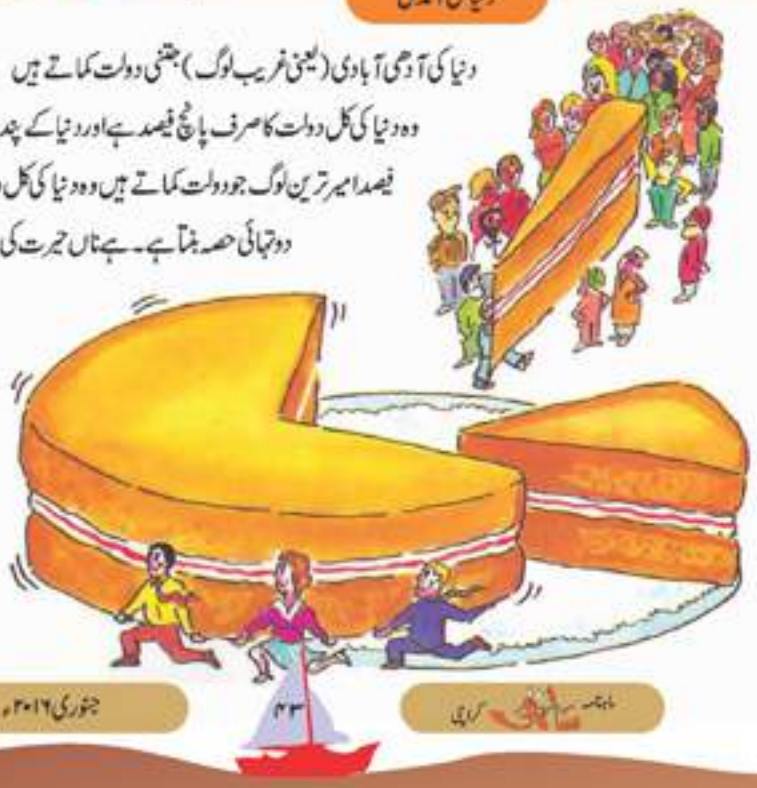

احمد حاطب صدیقی

سلیم مغل

شریف شیوہ

بچوں کا کُل پاکستان مشاعرہ

عبدالرحمٰن المومن

ننھے اور معصوم ذہنوں کی آبیاری کرتے ہوئے ماہنامہ ساتھی کو ۳۷ برس ہو گئے ہیں اور ان شاء اللہ یہ آئندہ بھی ننھے ذہنوں کی آبیاری کرتا رہے گا۔ ماہنامہ ساتھی میں قارئین کے لیے مزیدار کہانیاں، معلوماتی مضامین، خوبصورت نظمیں اور بہت سے مستقل سلسلے شائع کیے جاتے ہیں۔ ماہنامہ ساتھی کو اپنی تخلیقات سے سجانے والے شعرا اور قلم کاروں کے اعزاز میں ہر دو برس بعد ایک باوقار محفل ساتھی رائٹرز ایوارڈ کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں قلم کاروں کو بہترین تخلیقات کے اعتراف میں ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں بھی ساتھی رائٹرز ایوارڈ کا سال تھا۔ نومبر کے مہینے کی ۴ تاریخ کو ساتھی رائٹرز ایوارڈ کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ بچوں کا کُل پاکستان مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا اور اس مشاعرہ کے انعقاد کی وجہ سے ہی آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں۔

چار نو بمبر ساڑھے پانچ بجے ایکسپو سینٹر کے ہال نمبر ۶ میں جامعۃ النعمان کے ایک طالب علم نے کلام الٰہی کی تلاوت کر کے تقریب کا آغاز کیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد نعت رسولؐ پیش کی گئی۔ حضور اکرمؐ کی خدمت میں نعت پیش کرنے کے بعد ایک ایسے شاعر کی نظم سنوائی گئی جن کی آخری نعت ان کی رحلت کے بعد ماہنامہ ساتھی کی زینت بنی۔ میری مراد عبدالقادر عارفؔ صاحب سے ہے۔ عثمان پبلک اسکول کے ایک طالب علم نے عبدالقادر صاحب کی ایک خوبصورت نظم ''شرارت سے شرافت تک'' بہت خوبصورت انداز میں پڑھ کر انھیں خراج پیش کیا۔ عبدالقادر صاحب کو خراج پیش کرنے کے بعد نماز مغرب کا وقفہ کیا گیا۔ نماز کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا تو کاشف شفیع نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض سلیم مغل صاحب کو سونپ دیئے۔ سلیم مغل صاحب بچوں کے ایک معروف رسالے ''آنکھ مچولی'' کے مدیر رہ چکے ہیں۔

سلیم مغل صاحب نے بچوں کے ادب کے حوالے سے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''اس عہد میں بچوں کی طرف ہماری توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مغربی اقوام اپنے بچوں پر خرچ کرتی ہے، اُن کی اخلاقیات پر کتابیں تحریر کرتے ہیں، بچوں کے ادیبوں کا روشن مستقبل ہے، جبکہ پاکستان میں بچوں کے ادیبوں کا کوئی پُرسان حال نہیں، لیکن اس ماحول میں بھی شہر کراچی کے ہونہار طلبہ کی جانب سے اس طرح کی تقریب کا انعقاد باعثِ فخر ہے۔'' اُنھوں نے مزید کہا: ''بچوں کے لیے لکھنا اور خصوصاً نظم لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے خونِ جگر جلانا پڑتا ہے اور مبارک باد کے مستحق ہیں وہ قلم کار اور شعرا جو بچوں کے لیے لکھتے ہیں اور بلا معاوضہ لکھتے ہیں۔''

امریکا میں مقیم بچوں کے معروف شاعر تنویر پھول صاحب عدم موجودگی میں ان کی نمائندگی ان کے نواسے 'عمر بن

عزیز نے کی۔ تنویر پھول کی نظم 'چچا نہار ہے ہیں، پانی بہار ہے ہیں' نظم بہت اچھے انداز میں سنائی جس پر سامعین نے نظم اور بچے کے پڑھنے کو خوب داد و تحسین سے نوازا۔ تنویر پھول صاحب کی نظم کے بعد ساتھی میں لکھنے والے بچوں کے ہر دلعزیز نو جوان شاعر صفدر علی صفدرؔ کو دعوت کلام دی گئی۔ صفدر علی صفدر نے یہ نظم سنا کر سب کو سوچنے کی دعوت دی۔

زمیں اُڑتی پھرے گی آسماں نیچے بچھا ہوگا
ذرا سوچو تو ایسا ہوگا دُنیا میں تو کیا ہوگا

ستاروں کو پکڑ کر لوگ کمروں میں سجائیں گے
ہوا کو باندھ کر رکھیں گے گرمی میں چلائیں گے

کبھی سورج نہیں نکلا تو سُستی کی سزا دیں گے
اُٹھک بیٹھک کرائیں گے اُسے مرغا بنادیں گے

بچوں کا مشاعرہ اس وقت اور بھی بچوں کا ہوگیا۔ جب سلیم مغل صاحب نے اسٹیج سے اعلان کیا کہ جو بچے شعر سنا سکتے ہیں وہ اسٹیج پر آ کر شعر سنائیں۔ ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام بچوں نے ہی ٹھیک تلفظ کے ساتھ بالکل صحیح شعر سنائے۔ جن سے سامعین محظوظ ہوئے اور داد دیے بغیر نہیں رہ سکے۔ بچوں سے اشعار سننے کے بعد سلیم مغل صاحب نے لاہور سے تشریف لائے، اُفق دہلوی صاحب سے ان کا کلام سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُفق دہلوی صاحب نے اپنی خوبصورت نظم سے مشاعرے کو چار چاند لگائے۔

افق دہلوی صاحب سے کلام سننے کے بعد لاہور سے ہی آئے ہوئے ایک اور بچوں کے مقبول شاعر شریف شیوہ صاحب کو دعوت کلام دی گئی۔ شریف شیوہ صاحب نے بہت خوبصورت منظوم انداز میں بچوں تک اپنا پیغام پہنچایا۔

ایک ایسے شاعر جن کی بہت سی نظمیں بچوں کو یاد ہیں اور بچے ان کی نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھتے اور سناتے ہیں جب نعیم الدین نعیم صاحب کو دعوت کلام دی گئی تو انھوں نے بہت اچھے ترنم سے مشاعرے کی روداد منظوم انداز میں پیش کر کے بچوں اور بڑوں سے داد وصول کی۔ انھوں نے 'ساتھی مشاعرہ ہے' پڑھ کر مشاعرے کی تصویر کھینچی۔

بچوں نے نعیم الدین صاحب کے ساتھ ساتھ نظم پڑھ کر مشاعرے میں رنگ بھر دیے۔

ساتھی مشاعرہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا بچوں کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کے لیے اچھی اچھی نظمیں تخلیق کرنے والے شاعر 'شام درانی' صاحب کا جب نام پکارا گیا تو بچوں نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اُنھوں نے بہت خوبصورت نظم سنا کر مشاعرے کے سامعین سے داد وصول کی۔

شام درانی صاحب کی خوبصورت نظم کے بعد بچوں کے لیے سیکڑوں نظمیں لکھنے والے شاعر ضیاالحسن ضیا کو دعوت کلام

دی گئی۔ ضیا صاحب کی نظمیں بچوں کی تمام مقبول رسائل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

کراچی شہر کو ادبی منظر نامے میں ایک نمایاں نام 'منظر ایوبی صاحب' کا ہے۔ منظر ایوبی کا شمار استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری بچوں اور بڑوں دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ منظر صاحب نے جب اپنی نظم پیش کی تو بچوں نے ان کے ساتھ ساتھ ان کی نظم دہرائی جس سے مشاعرے میں جنگل کا اور جنگل میں منگل کا سماں ہوگیا۔

منظر ایوبی صاحب کی نظم نے مشاعرے کا جو ماحول بنایا تھا اسے برقرار رکھنے کے لیے جس شاعر کو دعوت دی گئی وہ اسلام آباد سے خصوصی طور پر مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان کی ایک نظم مقبول ہو کر زبان زد عام ہوگئی۔ جس طرح سلیم مغل صاحب سامعین کے امتحان کا صبر لیا تھا ہم اس طرح آپ کا امتحان نہیں لینا چاہتے ان کی نظمیں پڑھ کر آپ کو ان کی مقبولیت معلوم ہوگی۔ احمد صاحب نے اپنی ایک عمدہ نظم پڑھ کر سنائی۔

منو میاں کی گائے　　اوپر کو منہ اُٹھائے
پہلے تو بولے ہاں ہاں　　گردن کو پھر گھمائے
جیسے کوئی کسی کو　　آواز دے بُلائے
منو نے جب یہ دیکھا　　وہ دوڑے دوڑے آئے
پوچھا کہ کیا ہوا؟ کیوں　　کرتی ہو ہائے ہائے؟
بولی کہ آدمی کو　　اک گائے کیا بتائے؟
انساں کو اک مویشی
اب شرم کیا دلائے؟

جب احمد صاحب دو نظمیں پڑھ کر سامعین سے اجازت طلب کی تو عنایت علی خان صاحب آڑے آگئے اور انھوں نے حاطب صاحب سے ان کی مقبول عام سننے کی فرمائش کی تو حاطب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ''یہ بات سمجھ میں آئی نہیں'' نظم سنائی جو سامعین نے ان کے ساتھ ساتھ پڑھی۔

مشاعرہ اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سلسلہ کلام چلتے ہوئے صدرِ مشاعرہ عنایت علی خان صاحب تک پہنچ گیا۔ عطاء الحق قاسمی صاحب عنایت صاحب کے بارے میں کہتے ہیں: ''یہ ہمارے عہد کے پطرس بخاری ہیں۔'' عنایت صاحب کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے سنجیدہ اشعار پڑھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہوگا کہ عنایت صاحب مزاح کے شعر بھی کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جب آپ ان کے مزاح کے اشعار پڑھیں گے تو اندازہ نہیں لگا سکیں گے عنایت صاحب غزل کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ بچوں کے لیے اُنھوں نے بہت سی لاجواب نظمیں کہیں جن میں سے کچھ نظموں نے ماہنامہ ساتھی کو چار چاند لگائے۔ عنایت صاحب کو دعوتِ کلام دی گئی تو اُنھوں نے سب سے پہلے

ننھے بچوں کو ان ہی کی زبان میں نظم سنائی جو بچوں نے ان کے ساتھ دہرائی اور نظم سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

متھلی تا بچہ	پانی تھے بھلا
ابو نے پتلا	بھیا نے رتھا
باجی نے بتایا	امی نے پتایا
ہم تھب نے تھایا	بلا مجا آیا

عنایت صاحب نے بچوں کے سامنے پاکستان سے محبت کا اظہار اس طرح کیا۔

پیارا پاکستان	اللہ کا احسان
یہ گلشن آباد رہے گا	پاکستان آزاد رہے گا
پیارا پاکستان	اللہ کا احسان
ہم اس کے کام آئیں گے	اس کی شان بڑھائیں گے
پیارا پاکستان	اللہ کا احسان

مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچتے ہوئے ایک دلچسپ روپ اختیار کر گیا جب عنایت صاحب نے بچوں کے ساتھ (بسم اللہ والا) دلچسپ کھیل کھیلا۔

مشاعرے کا اختتام پروفیسر عنایت علی خان کی رقت آمیز دعا سے ہوا۔ بچوں کے ادب کی تاریخ میں یہ یادگار مشاعرہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ساتھی کے تحت ہونے والے مشاعرے کی روداد ملک بھر کے اخبارات کی نظر میں

سزا کی دعوت

صداقت حسین ساجد

وہ ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔اس میں ایک بڑا سا گھر تھا جس میں بلو اور پلو دو بھائی رہتے تھے۔ کہنے کو تو یہ ریچھ تھے لیکن ان کی عادات بالکل انسانوں والی تھیں۔ وہ انسانوں کی طرح بولتے تھے۔ چلتے بھی انسانوں کی طرح تھے۔انھیں وہ کام پسند تھے جو انسان کرنا پسند کرتے ہیں۔ان کے جسم پر بال زیادہ لمبے نہیں تھے اور دھبے بھی نہیں تھے۔وہ دونوں نوجوان تھے۔

ایک دن پلو نے اپنے دوستوں کے ساتھ کوہ پیمائی کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ اپنے دوستوں کے پاس پہنچا تو اچانک اسے پتا چلا وہ کمر پر لٹکانے والا بیگ گھر بھول آیا ہے۔اس بیگ میں ضروری سامان تھا۔اس کے بغیر تو کوہ پیمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیگ حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔اب وہ تیزی سے واپس پلٹا تا کہ اپنے گھر سے بیگ حاصل کر سکے۔

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔اس نے

اپنا ہاتھ دائیں جیب میں ڈالا وہ خالی تھی۔ پھر اس نے بائیں جیب دیکھی وہ بھی خالی تھی۔ اس کے پاس چابی نہیں تھی۔ وہ اپنی چابی کہیں بھول چکا تھا۔ گھر میں داخل ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بیگ نہ ملتا وہ کوہ پیمائی کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ کیا کرے۔

اچانک اسے یاد آیا، بلو اندر موجود ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوبارہ دستک دی لیکن اس بار بھی خاموشی طاری رہی۔

''اوہ..... نہیں.....''

بلو اندر نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔

''اب کیا کروں؟''

اچانک اسے یاد آیا تو وہ بولا: ''کوئی بات نہیں..... میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں جا سکتا ہے..... بلو کو پارک کی سیر کرنا پسند ہے۔ وہ اس وقت وہیں سیر کر رہا ہوگا۔''

پلو نے درست کہا تھا۔ بلو اس وقت پارک میں موجود تھا۔ وہ تیزی سے پارک کی طرف بڑھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ جب وہ پارک میں داخل ہوا تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ بلو پارک کے دوسرے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

اب پلو نے پورا پارک چھان مارا۔ اسے بلو کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ وہاں موجود ہوتا تو دکھائی دیتا نا۔ پلو پھر پریشان ہو گیا۔ اچانک اسے یاد آیا۔

''اوہ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا..... بلو پارک کی سیر کرنے کے بعد بازار جاتا ہے..... اب وہ یقیناً بازار میں ہوگا..... مجھے وہ وہیں ملے گا۔''

پلو نے درست کہا۔ بلو پارک سے نکل کر بازار چلا گیا تھا۔ اسے چند چیزوں کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ چیزیں ایک دکان سے خرید رہا تھا۔

پلو تیزی سے بازار کی طرف بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بلو سے اس کی ملاقات بازار میں ہو جائے۔ اس کی بد قسمتی ایک بار پھر اس کے آڑے آ گئی۔ وہ جس وقت بازار میں داخل ہوا، بلو اپنی خریداری مکمل کر کے بازار کی دوسری طرف سے باہر نکل رہا تھا۔ پلو نے پورا بازار دیکھ ڈالا لیکن بلو کہیں نہ ملا۔

''اب وہ کہاں جا سکتا ہے؟'' پلو پریشانی سے سوچنے لگا۔

''ہو سکتا ہے..... وہ گھر چلا گیا ہو؟'' پھر اس نے سوچا۔

''مجھے گھر جانا چاہیے..... امید ہے..... اب وہ گھر میں ہوگا۔''

اس کا خیال درست تھا۔ بلو بازار سے فارغ ہو کر سیدھا گھر چلا گیا تھا۔ اب جب بلو دروازے پر پہنچا تو اس نے اپنی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ چابی نکال کر دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ چابی اس کی جیب میں نہیں تھی۔ اب اس نے سوچا۔

''بائیں جیب میں ہوگی..... مجھے اس جیب میں دیکھنا چاہیے۔''

اس نے بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن وہ بھی خالی تھی اور اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ پریشان ہوگیا۔ نہ جانے چابی پتا نہیں کہاں گئی تھی؟

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اتنے میں پلو وہاں پہنچ گیا۔ پلو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اب وہ بیگ لے کر اپنے دوستوں کے پاس جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے بلو کو پریشان دیکھا تو پوچھا:

''کیا ہوا؟''

''میرے پاس چابی نہیں ہے.....''

''کیا..... کیا کہہ رہے ہو..... چابی نہیں ہے.....؟''

''ہاں..... ! چابی کہیں گم ہوگئی ہے..... تمھارے پاس جو چابی ہے..... وہ نکالو۔''

''میری بھی گم ہوگئی ہے..... اس لیے تو میں تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں..... میرا بیگ یہاں رہ گیا تھا۔''

''کیا.....؟''

اب وہ پریشان کھڑے تھے۔ ان کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔

''اندر کیسے جایا جائے؟''

کچھ سوچنے کے بعد پلو نے کہا:

''کھڑکیاں دیکھتے ہیں..... شاید کوئی کھلی رہ گئی ہو؟''

''ہاں..... ! یہ ٹھیک ہے۔''

اُنھوں نے نیچے والی کھڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ بدقسمتی سے وہ سب بند تھیں۔ اوپر ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھی۔ اُس تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ کس طرح اندر داخل ہوا جائے۔ اچانک پلو اچھلا:

''ہم آسانی سے اندر جا سکتے ہیں.....''

''اندر جا سکتے ہیں..... وہ کیسے؟''

''ہاں.....!''

''کیا تالا توڑ کر.....؟''

''نہیں.....''

''پھر کیسے؟''

''اس درخت کے ذریعے.....''

پلو نے اشارہ کیا تو بلو بھی اچھل پڑا۔

''اوہ..... واقعی! ہم آسانی سے اندر جا سکتے ہیں.....

''پریشانی میں اس کی طرف خیال ہی نہیں گیا۔''

گھر کے باہر پچھلی طرف ایک بہت بڑا درخت تھا۔ اس کے تنے میں ایک بہت بڑا سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں ایک لکڑی کی سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ قدرتی تھی۔

بلو نے اس سیڑھی کو استعمال کیا۔ وہ اوپر اس کھڑکی تک آسانی سے پہنچ گیا جو کھلی ہوئی تھی۔ ابھی وہ اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ ایک سپاہی ریچھ پہنچ گیا۔ اس نے بلو کو

یوں چوروں کی طرح اندر گھستے دیکھا تو للکار اٹھا۔

''ارے..... ارے! یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں اندر جا رہا ہوں۔''

''وہ تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے..... تمھیں پتا ہے.....؟''

''کیا پتا ہے.....؟''

''کسی کے گھر میں اس طرح داخل ہونا جرم ہے۔''

''یہ کسی کا نہیں..... ہمارا گھر ہے۔''

''کیا بات ہے..... بے وقوف کسی اور کو بنانا!''

''بے وقوف..... ہم نے کسے بے وقوف بنایا ہے؟''

''مجھے اور کس کو؟''

''کیا مطلب؟''

''ایک تو چوروں کی طرح اندر گھس رہے ہو اور اوپر سے کہتے ہو..... یہ ہمارا گھر ہے۔''

''جناب! ہم دونوں بھائی یہاں رہتے ہیں..... غلطی سے تالا لگا بیٹھے..... چابیاں اندر ہیں..... تالا توڑنا نہیں چاہتے تھے..... اس لیے ایسے اندر گھسنے لگے۔''

''کیا ثبوت ہے؟''

''اندر ہماری تصویریں موجود ہیں..... ہمارے دوست بھی اس بات کی گواہی دیں گے..... کہ یہ ہمارا گھر ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن پہلے میں اندر جاؤں گا..... میں دیکھتا ہوں..... تمھاری تصویریں اندر موجود ہیں یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے..... ہمیں منظور ہے۔''

ریچھ سپاہی اندر چلا گیا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ اتنی دیر میں وہ تصویریں دیکھ چکا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ بلو اور پلو سچے ہیں۔ چابیاں میز پر موجود تھیں۔

اتنے میں پلو کے دوست وہاں آ پہنچے۔ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ انھیں پریشانی ہونے لگی تھی کہ پلو کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اب وہ سب کے سب گھر میں گھس آئے تھے۔

پلو کی شامت آ چکی تھی۔ اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ کوہ پیمائی کے لیے جانا مناسب نہیں تھا۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ پلو سزا کے طور پر انھیں دعوت کھلائے گا۔ جلدی سے ایک بہت مزے دار دعوت کا انتظام کر دیا گیا۔ وہ بڑے مزے سے ہپ ہپ کر کے دعوت اڑا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریچھ سپاہی بھی تھا۔ وہ اب فارغ تھا، اس لیے اس نے دعوت میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا۔ اچانک پلو کا ایک دوست بولا۔

''پتا ہے..... اس دعوت کا نام کیا ہے؟''

''نہیں.....''

''سزا کی دعوت.....؟''

یہ سن کر سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

☆.....☆

اک عزم مصمم تھا
بیدار وہ پیہم تھا
مظلوم کا ہمدم تھا
تھیں اس کو بڑی فکریں
ٹھہرا ہوا زمزم تھا
ہاتھوں میں مجاہد کے
تھا کام بہت سارا
ملت کا مسیحا تھا
یہ پاک وطن اس کو
تھا پاسباں ملت کا
کیا بات نعیم اس کی
وہ فاتحِ
وہ قائد

وہ جہدِ مجسم تھا
مصروف وہ ہر دم تھا
انصاف کا پرچم تھا
ملت کا اسے غم تھا
باتوں میں بڑا دم تھا
اسلام کا پرچم تھا
اور وقت بہت کم تھا
ہر زخم کا مرہم تھا
ہر شہ سے مقدم تھا
انساں معظم تھا
شعلہ کبھی شبنم تھا
عالم تھا
اعظم تھا

سالنامہ.....بھرپور اور دلچسپ

اطہر علی ہاشمی

مدیرِ اعلیٰ روزنامہ جسارت

ابھی تو ہم نومبر میں شائع ہونے والے سالنامے ہی کا مزہ لے رہے تھے کہ دسمبر کا شمارہ بھی آ گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس شمارے میں بچوں کا کل پاکستان دلچسپ مشاعرہ اور ایوارڈ کی تقسیم کا ذکر تفصیل سے ہوگا اور مرحوم اشتیاق احمد کے بارے میں کوئی جامع مضمون یا ساتھی کو دیے گئے انٹرویو کا اعادہ ہی ہوگا۔ لیکن شاید یہ اگلے شمارے کے لیے بچا کر رکھ لیا ہے۔

اتنی اچھی اور بھرپور پیشکش پر کسی بھی قسم کی تنقید مناسب نہیں ہے۔ یوں بھی سالنامہ ایک جن کے ہاتھ میں ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ جنات میں بھی مقبول ہے، کوئی جن ناراض بھی ہوسکتا ہے۔ ہم سب سے پہلے ''اپنے حس مزاح'' کو جانچنے کے لیے لطیفے پڑھتے ہیں۔ سارے ہی لطیفے معیاری ہیں۔ کھلکھلاہٹ نہ سہی، مسکراہٹ ضرور آ جاتی ہے۔

چلیے، سب سے پہلے اعظم طارق کوہستانی کے سیاہ ناخن کی خبر لیتے ہیں۔ کہانی دلچسپ ہے لیکن کہانی پر زیادہ توجہ دینے یا ایڈیٹنگ کی ضرورت تھی۔ عموماً تحریروں میں اس عیب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ جو ''شترگربہ'' کہلاتا ہے یعنی ایک ہی شعر یا جملے میں ''آپ اور تم'' یا ان اور اس کو یکجا کر دینا۔ ایک شعر سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

چلیں میری فکر نہ کیجیے، مگر اپنا فائدہ سوچیے

تمھیں جس کی چھاؤں عزیز ہے، میں اسی درخت کا ہوں ثمر

پہلے مصرع میں احتراماً چلیں، کیجیے وغیرہ ہے اور دوسرے مصرعے میں ''تمھیں'' جب کہ یہاں آپ کو کا محل تھا۔ ایسے ہی نثر میں ''کچھ معاہدے بہت خفیہ رکھے گئے اور اس کا علم صرف چند لوگوں کو ہے۔ یہاں اس کی جگہ ان لکھنے میں کیا قباحت تھی۔؟ ایک دلچسپ

جملہ ہے ''کمرے کے اطراف میں صوفے۔'' اس سے لگتا ہے جیسے کمرے کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر اطراف میں صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایسا کہیں دیکھا تو نہیں، کوہستانی علاقے میں بھی نہیں۔ ایک اور جملہ ہے ''صاف مکر گیا کہ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔'' ہونا یہ چاہیے تھا کہ ''ایسا کوئی معاہدہ ہوا ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال اسی صفحے (84) پر۔

''آرمی چیف کی لاعلمی کے بغیر بھلا کچھ ہوسکتا ہے۔'' بھائی اعظم طارق، اس کا کیا مطلب ہوا؟ لاعلمی کے بجائے علم کے بغیر ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ 85 پر جملہ ہے ''تو امریکا کی سی آئی اے کیا منہ لے کر رہ جائے گی۔'' سی آئی اے غالباً صرف امریکا ہی میں ہے اور کہانی کے آغاز میں یہ بتا بھی دیا گیا۔ لیکن ''کیا منہ لے کر رہ جائے گی؟'' کونسا محاورہ یا روز مرہ ہے؟ کیا منہ دکھائے گی یا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گی وغیرہ تو سنا ہے۔ جاسوس جیمز کبھی تو ''تھا'' ہوجاتا ہے پھر امریکا کا خیال آتے ہے احتراماً ''تھے'' ہوجاتا ہے جیسے ''وہ آئیڈیا بتانے لگے۔'' ہمارے خیال میں یہ رسالہ امریکا نہیں جائے گا۔ ''باچھیں'' جمع ہیں، واحد نہیں۔ (صفحہ 85) اور بھائی کوہستانی، یہ ''مائع جیسی گیندیں'' کیا اور کیسی ہوتی ہیں۔ مائع سے بھری ہوئی تو ہوسکتی ہیں لیکن مائع کی گیندیں! شاید ہوتی ہوں۔ ہم نے میٹرک کے بعد سائنس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

اور بھی کچھ چھوٹی موٹی غلطیاں ہیں جیسے سامنے موجود پانی کے کولر سے پانی پیا۔ تو اور کیا اس میں سے دودھ نکلتا۔ صرف ''کولر سے پانی پیا'' لکھنے سے بھی پیاس بجھ جاتی۔

احمد عدنان طارق کی ''اوکاپی کی تلاش'' دلچسپ ہے۔ غلطیاں تو نہیں، بس کہیں کہیں سہو ہے۔ اب اتنے گھنے جنگل میں کچھ ڈھونڈنا تو مشکل تھا۔ ''اوڑھادی'' بغیر واڈ کے اڑھادی جاتی تو اچھا تھا۔ ''سمجھ نہ آئی'' پر پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ یہ ترکیب صحیح نہیں ہے۔ آخر الیاس نواز نے بھی تو ''سمجھ میں نہیں آئے گا'' لکھا ہے (صفحہ 38)۔ صفحہ 32 پر ''بھیک منگا'' کے بجائے ''بھک منگا'' فصیح ہے۔ برسبیل تذکرہ ''گھڑدوڑ'' میں تو گھوڑے کی دو ٹانگیں نکال دی جاتی ہیں۔ الیاس نواز کے خاکے میں کسی رازداں نے ''سمجھ نہ آتا'' ہی کو صحیح سمجھا ہے۔

پروفیسر عنایت علی خان کے لیے خاص انٹرویو میں مشینی کتابت کی خاصی غلطیاں ہیں جن سے شاید مزاح پیدا کیا ہے۔

ہر چند کی یہ غلطی نہیں ہے بلکہ غلط العام ہونے کی وجہ سے اسے فصیح (فصیح اللہ حسینی نہیں) قرار دے دینا چاہیے اور ویسے بھی یہ گنوار چی خانہ میں ہے اس لیے نظر انداز کردینا چاہیے۔ یہ ہے ''تخم ملنگا۔'' (صفحہ 39) اہل پنجاب تو اسے تخ ملنگا کہتے ہیں۔ لیکن

ساتھیوا یہ لفظ فارسی کا ہے اور فارسی میں اسے ''بالنگو'' کہتے ہیں تاہم یہ تخم بالنگا کے نام سے مل جائے گا بشرطیکہ پنساری یہ نہ پوچھے، اچھا، آپ کو تخ ملنگا درکار ہے۔ اسی گنوار چی خانہ میں غالب پر ''گرہ'' لگائی گئی ہے ''مصالحہ، مصالحہ گرم دیکھتے ہیں۔'' یہاں مسالہ لکھنا بہتر تھا ورنہ مصالحہ بھاری پڑ جاتا ہے۔ ویسے بھی کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ مصالحہ کی جگہ مسالہ کہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ مسلا ہوا ہو، ثابت کو مسالہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ''ثابت مسور کی دال'' اور ثابت ماش کی دال بھی تو کہتے ہیں جب کہ دال تو دلنے کے بعد بنتی ہے اور ثابت نہیں رہتی۔

جاوید بسام کا خاکہ دلچسپ ہے۔ ایک جملے میں کچھ گڑبڑ ہے۔ ان کی بیٹی نے پوچھا تھا ''آپ میرے ابو کی کہانیاں آخر میں کیوں لگاتے ہیں۔'' اس میں ''میں'' زاید ہے یعنی ''آخر کیوں لگاتے ہیں؟'' ہوگا ورنہ ''آخیر'' میں ہوتا۔

بینا صدیقی نے پانچ والیں ملا کر ''مکس دال'' بنائی ہے۔ یقیناً مزیدار ہوگی۔ لیکن اس کے لیے ''کیوٹی دال'' استعمال ہوتا ہے جو لغت میں تو ہے لیکن اب شاید نامانوس ہوتا جارہا ہے گو کہ خواتین اس لفظ سے واقف ہیں۔ اس اصطلاح کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے اس کو ''پنج میل دال'' بھی کہا جاتا ہے۔ کہانی اچھی ہے۔

گھر پر اثرات (صفحہ 104) کی جگہ گھر میں اثرات مناسب تھا۔ فوزیہ خلیل نے باتوں باتوں میں اچھا سبق دیا ہے۔

چہ مگوئیاں (صفحہ 143) کی جگہ چہ میگوئیاں (می گوئیاں) صحیح ہے، بچے خیال رکھیں۔ خطوط سالنامے کی مناسبت سے بہت سے اور دلچسپ ہیں۔ کومل فاطمہ اللہ بخش ''انر ٹائکلل'' کا ترجمہ تلاش کرلیں اور ہمیں بھی بتائیں۔

☆.....☆

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جو جانے والے سے عبرت حاصل نہیں کرتا وہ آنے والے کے لیے عبرت بن جاتا ہے۔

☆ دل پر زیادہ تر مصیبت آنکھوں کی وجہ سے آتی ہے۔

☆ حقیر سے حقیر پیشہ ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔

☆ برے دوستوں سے بچو کیوں کہ وہ تمھارا تعارف بن جاتے ہیں۔

☆ آپ جنھیں بیوقوف سمجھ رہے ہوتے ہیں دراصل وہ آپ کی حرکتیں نظر انداز کررہے ہوتے ہیں۔

☆ اگر عیاشی کو ابتدا میں نہ روکا جائے تو وہ آہستہ آہستہ ضرورت بن جاتی ہے۔

(مرسلہ: شاہنواز قریشی، لاہور)

ساتھی رائیٹرز ایوارڈ

عبدالصمد بھٹی

.....ایک یادگار اور پُروقار تقریب کا دلچسپ تذکرہ.....

لنگڑاتے پاؤں اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، دونوں کو اپنے سر پر کھڑا پایا۔ ''کہاں ہیں بھائی آپ؟ ادھر کام سارا ایسے پڑا ہوا ہے اور آپ ایکسیڈنٹ کر کے بیٹھ گئے''۔ یہ دونوں صاحبان اعظم طارق کوہستانی اور سید طلال علی تھے جو ایکسپو سینٹر میں میرا استقبال کر رہے تھے۔ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب سے چند دن قبل ایک حادثے کے نتیجے میں چلنے سے معذور ہو گیا اور اس کی تیاریوں میں بھرپور حصہ نہیں لے سکا تو یہ برادران میرا حساب کتاب برابر کرنے کے لیے میرا راستہ روک کے کھڑے ہو گئے۔ ''اب آپ آ گئے ہیں تو انعامات کو دیکھ لیں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے''۔ اعظم بھائی یہ کہہ کے آگے چل دیے اور میری سانس بحال ہوئی۔

ساتھی رائٹرز ایوارڈ، ماہنامہ ساتھی کی ایک درخشندہ روایت ہے۔ ساتھی رائٹرز ایوارڈ کی تقریب ہر دو سال بعد منعقد کی جاتی ہے جس میں ساتھی کے لیے بہترین ادب تخلیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ساتھی رائٹرز ایوارڈ کی اس سال کی خاص بات یہ تھی کہ

اس بار کراچی ایکسپو سینٹر میں ہوئی۔ اس تقریب میں ملک بھر سے لکھنے والے افراد، دیگر رسائل کے مدیران، ماہنامہ ساتھی کے سابق مدیران اور قارئین کی ایک بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں ''نشانِ سپاس'' کے نام سے اُن لوگوں کو بھی یاد رکھا جاتا ہے جو ہمارے ساتھ کام کرتے رہے یا ہمارے لیے کام کرتے رہے اور بالآخر داعی اجل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے۔ شام چھے بجے تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ مسحور کن تلاوت کی سعادت اس بار بھی ''عکاشہ بشارت'' نے حاصل کی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض حسب سابق کاشف شفیع صاحب نے ادا کیے۔ تلاوت اور نعت کے بعد نمازِ مغرب کا وقفہ کیا گیا۔ نماز کے بعد دوبارہ آغاز ہوا تو بچوں کی ایک بڑی تعداد اسٹیج کے سامنے موجود تھی اور تمام مہمانان بھی شریک ہو چکے تھے۔ رائٹرز ایوارڈ کے ساتھ ساتھ اس بار چونکہ ''مشاعرے'' کا بھی اہتمام کیا گیا تھا لہٰذا محترم کاشف شفیع نے مائیک پروفیسر سلیم مغل صاحب کے حوالے کیا۔

مشاعرے کے درمیان میں ایک بار پھر کاشف شفیع اسٹیج پہ آگئے اور مشاعرے کو مجبوراً روکنا پڑا کیونکہ کاشف شفیع زیادہ دیر مائیک کے بغیر نہیں رہ پا رہے تھے۔ کاشف شفیع نے محترم کلیم چغتائی (بانی مدیر ماہنامہ ساتھی) صاحب کو اسٹیج پر بلایا۔ کلیم چغتائی صاحب نے سال ۲۰۱۴ء کے انعام یافتگان کو ایوارڈز دیے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے اپنے خطاب میں ساتھی کی اس کاوش کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا: ''چند نوجوانوں نے جو کام آج سے ۳۷ سال پہلے شروع کیا تھا وہ بنا کسی وقفے اور تعطل سے ہو رہا ہے۔ یہ ایک بہت منفرد کام ہے پاکستان کی تاریخ میں۔ یہ نوجوان مبارک باد کے مستحق ہیں اور اللہ کی خاص رحمتیں ہوں ان پر کہ جو اتنا بامقصد اور معیاری رسالہ ہر مہینے آپ کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یقیناً آپ سب بھی اس رسالے کو پڑھ کر اس سے اپنے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔'' محترم کلیم چغتائی صاحب کے بعد خواتین لکھاریوں میں انعامات تقسیم کرنے کے لیے محترمہ افشاں نوید (معروف کالم نگار، مصنفہ) کو بلایا گیا۔ محترمہ افشاں نوید نے اپنے خطاب میں ماہنامہ ساتھی کو ان الفاظ میں مبارک باد دی: ''ماہنامہ ساتھی کی اس تقریب کو دیکھ کر اور اس میں شامل ہو کر دلی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ہمارے ملک میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماہنامہ ساتھی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اتنی خوبصورت تقریب سجائی اور لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یقیناً اس کے نسلِ نو پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے ان شاء اللہ''۔

اس کے بعد تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب اطہر علی

ہاشمی صاحب (مدیر اعلا روزنامہ جسارت) کو دی گئی۔ اطہر ہاشمی صاحب نے اپنے خطاب میں کہا: ''اِس تقریب میں آنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ اس طرح کی تقریب اور مجمع دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ کسی رسالے کے منتظمین کی طرف سے یہ بھرپور نظارہ اس سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔ اس تقریب میں شامل تمام لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں''۔

اس کے بعد سید فصیح اللہ حسینی (مدیر ماہنامہ ساتھی) نے مہمانان میں انعامات تقسیم کیے۔ آخری مرحلے میں عنایت علی خان صاحب نے شعرا میں انعامات تقسیم کیے جبکہ ڈائریکٹر بزم ساتھی کراچی نصرت علی نے اس فانی دنیا سے کوچ کر جانے والوں کے ورثا کو ''نشانِ سپاس'' دیا۔ نشانِ سپاس کی فہرست میں اس بار ایک ایسی پاکباز ہستی کا نام بھی تھا کہ جس کے ذکر سے آج بھی ہر بڑے چھوٹے کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور کچھ کھو جانے کا دکھ تازہ ہو جاتا ہے۔ شمعون قیصر بھائی کی والدہ کو جب نشانِ سپاس کے دعوت دی گئی تو تقریب میں موجود ہر فرد کی آنکھوں میں آنسو تھے سب کا دکھ ایک جیسا تھا۔ ابھی پچھلی رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں تو وہ ہمارے ساتھ تھے۔ ہر کام میں ہر منصوبہ بندی میں۔ اسی طرح ہم سے بچھڑ جانے والوں میں اس بار جناب وقار محسن، عبدالقادر عارف، عباس العزم صاحب ایسی ہستیاں تھیں کہ جن کے نام تو پکارے گئے لیکن وہ اپنا انعام لیتے ہوئے یا کسی سے ملتے ہوئے کہیں نظر نہ آئے (اللہ غریقِ رحمت کرے)۔

نشانِ سپاس

محمد انوار احمد | شہید شمعون قیصر | مظہر یوسف زئی | قاسم بن نظر | چودھری بلال حنیف

وہ جو آج ہم میں نہیں لیکن اُن کی یادیں ہمارے دلوں کو ہمیشہ منور کرتی رہیں گی

ایوارڈز پانے والے مضمون نگار، کہانی نویس اور شعرا

بہترین کہانی (۲۰۱۳ء)	بہترین کہانی (۲۰۱۴ء)	بہترین مضامین
جاوید بسام	سیما صدیقی	فریال یاور مرحومہ (اسلامی مضمون)
وقار محسن (مرحوم)	اشتیاق احمد	مجیب ظفر انوار حمیدی (سوانح)
نائلہ صدیقی	ابن آس محمد	محمد علی ادیب (تاریخی مضمون)
الیاس نواز	اختر عباس	رانا محمد شاہد (مضمون شخصیات)
ڈاکٹر عمران مشتاق	بینا صدیقی	میر بابر مشتاق (مضمون حیوانیات)
حمیرا خاتون	راحمہ خان	میر شاہد حسین (کہانی کیسے لکھیں؟)
اُم ایمان	فاطمہ نور صدیقی	گل رعنا (بہترین مترجم)
عافیہ رحمت	راحت عائشہ	قاضی مظہر طارق (معلوماتی مضمون)
جدون ادیب	احمد عدنان طارق	حماد ظہیر (ناول)
شازیہ فرحین	فوزیہ خلیل	سروش حسن (بہترین انٹرویو نگار)
فہیم احمد	عظمیٰ ابونصر صدیقی	الطاف حسین (مضمون پاکستانیات)
فرحی نعیم	فرحت طاہر	علیم احمد (سائنسی مضمون)
پیر نوید شاہ	روزینہ جاوید	**نوجوان تخلیق کار**
شہناز اصغر	**بہترین نظم (۲۰۱۴ء)**	سمیرا امیر
بہترین نظم (۲۰۱۳ء)	عبدالقادر عارفؔ (مرحوم)	ماہم جاوید
	تنویر پھولؔ	سیدہ ارفع معراج
شام درانیؔ	ضیاء الحسن ضیاؔ	رمشاء جاوید
عباس العزمؔ (مرحوم)	صفدر علی صفدرؔ	عائشہ خلیق الرحمٰن
امجد شریف	ضیاء اللہ محسنؔ	گمینہ امیر
حکیم خان حکیمؔ	اُفق دہلویؔ	ردا فاطمہ
مہران سانولؔ	نعیم الدین نعیمؔ	رُومیسہ اسحاق

کلیم چغتائی (بانی مدیر ماہنامہ ساتھی) بہترین مضامین تخلیق کرنے والوں کو شیلڈز پیش کررہے ہیں

محترمہ افشاں نوید (معروف کالم نگار، مصنفہ) خواتین قلمکاروں کو شیلڈز دے رہی ہیں

محترم اطہر ہاشمی (مدیر اعلا روزنامہ جسارت) سال ۲۰۱۴ء کے بہترین لکھاریوں کو شیلڈز دیتے ہوئے

ساتھی رائٹرز ایوارڈ ۲۰۱۵ء کی پررونق اور پروقار تقریب میں خواتین، مرد اور بچوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی

ساتھی مصوّری

☆ مصوری بھیجنے والے ساتھی اپنی ڈرائنگ میں گہرے رنگوں کا استعمال کریں۔ ڈرائنگ شیٹ یا پھر A4 سائز کا سادہ کاغذ استعمال کریں۔ ڈرائنگ کے اوپر اپنا نام ہرگز تحریر نہ کریں بلکہ کاغذ کی پشت پر اپنا نام، فون نمبر، پتا اور کلاس لکھیں۔ ☆ برقی پتے (ای میل) کے ذریعے ڈرائنگ بھیجنے والے اپنی تصاویر کو اسکین کر کے بھیجیں، موبائل کی تصویر قابل قبول نہیں ہوگی۔

ایک انچ کی کلی

رمشا جاوید

غرور کا سر تو ہمیشہ سے نیچا تھا ایک بار پھر غرور خاک میں مل گیا

بیگم وقاص کو گلاب کی ننھی کلی پر جھکا دیکھ کر آم بھیا نے منہ بنا لیا۔

"مالی بابا..... دیکھیں یہ کلی تو کھل ہی نہیں رہی ہے آپ اس کلی کا خاص خیال رکھا کریں۔ یہ انگلش گلاب کا پھول مجھے بہت پسند ہے۔" بیگم وقاص مالی بابا کو ہدایات دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"روٹی کو دودھ میں بھگو کر اس کی پتیوں کو صاف کیا کریں۔"

"جی بالکل" مالی بابا نے کہا تو بیگم وقاص لان کے تمام پودوں، پھولوں اور درختوں پر سرسری نگاہ ڈال کر اندر کی جانب چلی گئیں۔

"ہونہہ— بیگم وقاص خواہ مخواہ اس ایک انچ کی کلی کے لیے پریشان رہتی ہیں۔" بیگم وقاص کے جاتے ہی آم بھیا نے امرود بھیا سے اپنے دل کی بھڑاس

نکالی۔

''ہاں بالکل..... انھیں اس کلی کو اپنے لان سے ہٹا دینا چاہیے۔'' امرود بھیا نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

''یہ چھوٹی سی کلی ہمارے لیے ایک بدنما داغ ہے۔'' انار کے درخت نے حقارت سے کہا۔ ان کی باتیں سن کر ننھی کلی جو پہلے ہی سمٹی ہوئی تھی مزید سمٹ کر چھوٹی سی ہوگئی۔

☆.....☆

اگلے دو دن بیگم وقاص کے لان میں بڑی ہلچل مچی رہی۔ انہوں نے دیسی گلابوں کا خوبصورت سا گلابی پودا خرید کر گل کے پاس لگوایا تھا۔ اس میں نہایت حسین بڑے بڑے گلابی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ تو یونہی گلابی کا آس پڑوس میں تعارف کروانے میں گزر گیا۔ گلابی کلی دھیمے مزاج کی خوش اخلاق کلی تھی۔ باتوں کی تو وہ نہایت شوقین تھی ایسے میں وہ گل سے باتیں نہ کرتی..... یہ تو ناممکن سی بات تھی۔

تمھیں یہاں آئے کتنے دن ہوئے ہیں؟'' گلابی کلی نے مسکرا کر گل سے سوال کیا تو آم بھیا بولے۔

''ارے اسے آئے پورے پندرہ دن ہوگئے ہیں۔ مگر اس کا قد چھوٹا ہے اور یہ تھوڑی مغرور بھی ہے کسی سے بات نہیں کرتی۔''

''ہاں ہاں ہر وقت منہ چھپائے رکھتی ہے۔ بیگم وقاص اس کی وجہ سے کافی پریشان رہتی ہیں۔'' چمیلی کے پھول نے بھی آم بھیا کی طرف داری کی۔

گلابی کلی صرف ہم م کر کے رہ گئی۔ گل کے لیے یہ بات شرمندگی کا سبب بنی کہ ایک نئے مہمان کے سامنے بھی اس کے 'قد' کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

''ارے قد سے کیا ہوتا.....'' گلابی کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ جھٹ سے امرود بھیا بول پڑے۔

''اصل خوبصورتی تو قد ہی ہے۔ مثال کے طور پر آم کو دیکھ لو گلاب نہ ہو کر بھی اس کی اتنی اہمیت ہے کہ بیگم وقاص گرمیوں کی شام میں آم کی لمبی اور گھنی شاخوں کے نیچے ہی بیٹھتی ہیں۔'' امرود کی بات پر آم بھیا فخر سے مزید اکڑ گئے۔

''ہاں..... آم بھیا کا قد تو ماشا اللہ بہت ہی اچھا ہے۔'' گلابی نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو آم بھیا نے ایک ادا سے تمام درختوں کی جانب دیکھا اور کہا

''اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کے سامنے بیگم وقاص نے اس ایک انچ کی کلی کو لگا کر غلطی کی ہے۔''

☆.....☆

''مالی بابا..... آپ جلد ہی آم کے درخت کی شاخوں کی کانٹ چھانٹ کر دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی شاخیں بجلی کی تاروں سے الجھ جائیں گی اور کوئی نقصان ہو جائے گا۔'' وقاص صاحب مالی بابا کو ایک ایک درخت اور پودے کے متعلق الگ الگ ہدایات دے رہے تھے۔

آج تو نہیں مگر کل ضرور کردوں گا بیٹا۔'' مالی بابا نے کہا۔

ٹھیک لیکن یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' وقاص صاحب اب ننھی کلی کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے تھے۔

''یہ ننھی کلی مجھے بالکل انشراح بیٹی کی طرح لگتی ہے۔'' انھوں نے انگلی کے پوروں سے گل کو چھوا تو اس نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ خلوص و محبت کا لمس پا کر مارے گھبراہٹ کے اس کی ننھی پتیوں پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔

''ارے بیٹا یہ کلی تو کافی دن سے یونہی مرجھائی مرجھائی سی ہے۔ میں اس کا کافی خیال رکھتا ہوں مگر سب بے سود تم میری مانو تو اس گلاب کو یہاں سے ہٹادو۔''

ننھی کلی کو یوں لگا جیسے بابا کے روپ میں آم بھیا کہہ رہے ہوں۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں بابا..... یہ گلاب تو پچھلے مہینے ہی میری انشراح بیٹی کی پیدائش پر ابا نے تحفتاً دیا ہے۔ اس میں تو مجھے انشراح بیٹی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔'' وقاص صاحب قدرے ناراضی سے بولے۔

''یہ پودا چھوٹا ضرور ہے مگر اس کی خوشبو سب سے الگ ہے۔''

''یہ خوشبو دے تو بات بنے ناں بیٹا۔'' مالی بابا نے مایوسی سے کہا۔ تمام پودے اور درخت ان دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ گلابی کلی نے دھیرے سے گل کی جانب دیکھا جو کبھی وقاص صاحب اور کبھی مالی بابا کو دیکھ رہی تھی۔

''تمھارے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں تم اپنے قد کی وجہ سے ان سب خوبیوں کو ختم کر رہی ہو۔'' گلابی کلی سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''مگر امرود بھیا کہتے ہیں اصل چیز قد ہے پھر تمام خوبیاں۔'' گل معصومیت سے بولی۔

''دیکھو ناں آم بھیا بھی تو صرف قد کی وجہ سے سب کے ہر دل عزیز بنے ہوئے ہیں۔

''دیکھو خدا نے جو چیز تمھیں دی ہوئی ہے اس پر شکر ادا کرو کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ اچھی چیزیں بھی ہمارے لیے مصیبت کا سامان پیدا کرتی ہیں۔'' شاید گلابی کی یہ بات آم نے سن لی اور وہ تیز لہجے میں گویا ہوا۔

''سنو میرے دوستو! گل کی وجہ سے ہماری اصل خوبصورتی ماند پڑتی جا رہی ہے۔ ہم مل کر احتجاج کریں گے کہ گل کو یہاں سے ہٹادیا جائے ہم احتجاجاً اپنے اوپر کوئی پھل اور پھول لگنے نہیں دیں گے۔ جب تک گل یہاں رہے گی ہم اپنی بہاریں کھل کر نہیں دکھا سکیں گے۔ اس احتجاج میں کون کون میرے ساتھ ہے؟''

آم کی بات پر پہلے تو تمام درختوں اور پودوں نے

حیرت سے اسے دیکھا پھر سب اس کی طرف ہو گئے سوائے گلابی کلی اور رات کی رانی کے۔

☆......☆

رات کا نجانے کونسا پہر تھا۔ جب آم کی گھنی شاخیں بجلی کی تاروں میں الجھ گئیں۔ نیند کے خمار میں اس نے ایک جھٹکے سے شاخوں کو کھینچا تو ساتھ ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بجلی کی تاریں وقاص صاحب کی دیواروں پر گر گئیں۔ پنکھے بند ہو گئے اور اے سی کے اسٹیبلائزر سے چنگاری نکلی۔ وقاص صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ بھاگم بھاگ اسٹیبلائزر کو بند کیا۔ دیواروں میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ انھوں نے کے ای ایس سی کے دفتر فون کر کے حالات کی سنگینی کا بتایا اور مدد کی درخواست کی۔ آن کی آن میں پورا محلہ جمع ہو گیا۔ کے ای ایس سی کی گاڑی آئی اور تاروں کو جوڑا۔ اسی وقت وقاص صاحب نے آم کے درخت کو جڑ سے کٹوا دیا۔ قد کی لڑائی ختم ہوئی اور اگلے دن سب نے دیکھا کہ انگلش گلاب کی کلی پوری طرح سے کھلی اپنی خوشبو سے پورے لان کو معطر کر رہی تھی۔

☆......☆

روشنی کا مینار

جہاز رانی میں خطرات سے بچنے کے لیے خصوصاً جب وائرلیس کی امداد حاصل نہ ہو، جہاز چلانے والوں کو نقشے پر کچھ معین نقطوں (مخصوص مقامات) کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کی مدد سے سمندر پر اپنے مقام کا علم ہو سکے اور خطرناک علاقوں سے بچا جا سکے، رات کے وقت یا دن کو جب مطلع ابر آلود ہو اور کہر کی وجہ سے نگاہ دور تک کام نہ کر سکے، ان معین مقامات پر اونچے منارے بنا کر بالائی حصے میں تیز روشنی کی جاتی ہے۔ جس جگہ مینار بنانے دشوار ہوتے ہیں وہاں جہاز لنگر انداز کر کے ان پر مینار بنا لیے جاتے ہیں۔ گیس جلا کر یا بجلی کے ذریعے روشنی پیدا کی جاتی ہے اور اس روشنی کو شیشوں اور منعکس آئینوں کے ذریعہ سیدھی کرنوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ میناروں میں تیز کرنے کے لیے یہ کرنیں مختلف تواتر سے مختلف وقفوں کے بعد مشین کے ذریعے سے مینار سے باہر پھینکی جاتی ہیں۔ اس طرح سے جہاز ران ہر مینار کو پہچان لیتے ہیں۔

بعض مقامات پر پیپوں کو روشن کر کے مینار کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ پیپے ایک ہی جگہ تیرتے رہتے ہیں اور انہیں خطرناک مقامات کے اردگرد باندھ دیا جاتا ہے۔

شاعر سب شرمائے تھے

شریف شیوہ

جتنے بھی یہاں پر آئے ہیں　　کیا کیا نہ ادائیں لائے ہیں
جب پڑھتے ہیں کوئی مصرع　　گپ شپ وہ لگاتے ہیں کیا کیا
وہ شعر جو گھڑ کر لائے تھے　　ان سب پہ لطیفے چھائے تھے
کرتے تھے بیاں وہ پہیلی بھی　　تھی ساتھ میں ، گپ کی سہیلی بھی
آتی تھی جسے بھی اداکاری　　بچوں کے لیے تھا پھلواری
لیتے تھے اُس کو ہاتھوں ہات　　آئے نہ سمجھ میں چاہے بات
جب بچے لطیفے سُنتے تھے　　سب اپنے سروں کو دھنتے تھے
باتونی وہاں پر چھائے تھے　　اور شاعر سب شرمائے تھے

ہمارا کیا قصور

جی ہاں ساتھیو! اگر آپ کی تحریر قابل اشاعت نہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟
کبھی آپ نے اپنی غلطیوں کے بارے میں سوچا ہے کہ کہیں آپ کی تحریر.....

- ? نقل شدہ تو نہیں
- ? بہت زیادہ طویل تو نہیں
- ? عام موضوع پر لکھی گئی تحریر تو نہیں
- ? ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں مختلف سلسلوں کے لیے تو نہیں لکھی گئیں۔
- ? کہیں پنسل سے اور خراب لکھائی میں تو نہیں۔
- ? کہیں نظم بغیر اصلاح کے تو ارسال نہیں کر دی۔

یا

اگر نہیں تو پھر غلطی ہماری ہے

اور ہاں.....ایک دو باتیں اور.....

تحریر پر اپنا نام، مکمل پتا اور تاریخ ضرور لکھیں

یاد رکھیں: بڑا ادیب بننے کے لیے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے

صفحے کے ایک طرف خوشخط اور سطر چھوڑ کر تحریر کریں

تحریر بھیجنے کے بعد دوبارہ منگوانے کی ضد نہ کریں، بلکہ فوٹو اسٹیٹ کروا کر پہلے رکھ لیں

تاریخ کی کھوج

سلسلہ نمبر ۳

ساتھیو! ہو جائیں تیار..... کیوں کہ ساتھی ایک بار پھر لایا..... ایک نیا اور انوکھا انعامی سلسلہ..... تاریخ کی سیر کیجیے..... مسلم حکمرانوں، سیاست دانوں، سائنس دانوں اور ان شخصیات سے ملیے جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا..... بذریعہ قرعہ اندازی جیتنے والے ساتھیوں کو **اکیڈمی بک سینٹر** کی جانب سے دی جائیں گی ڈھیر ساری کتابیں اور تاریخی سی ڈیز..... تو پھر تیار ہیں ناں آپ..... تاریخ کی کھوج کے لیے.....!!

مقدس ہستیوں کی مقدس سرزمین۔ مسلمانوں کے عظیم ورثے کی امانت دار سرزمین جو انسانی تاریخ کے آغاز سے ہی دنیا کا مرکز رہی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد بارہ میں سے دس قبائل نے اس سرزمین کے شمالی علاقے میں اپنی سلطنت قائم کی۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشوریوں نے اس سلطنت پر قبضہ کرلیا، یہاں کے لوگوں کا قتلِ عام ہوا اور بچ جانے والے قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے۔ اس حادثے کے ساٹھ سال بعد شاہِ فارس، سائرس نے قیدیوں کو اپنی سرزمین جانے کی اجازت دے دی۔ سکندر اعظم نے ۳۳۲ قبل مسیح، ۳۲۰ قبل مسیح میں بطلیموس نے اور ۶۶ قبل مسیح میں پامپی (رومی) نے ان علاقوں کو زیر کیا۔ ۷۰ء میں رومیوں نے اس قوم کو تہ تیغ کیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت (۶۳۶ء) میں مسلمانوں نے یہاں قبضہ کیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں عیسائیوں نے اس سرزمین کو حاصل کرنے کے لیے کئی مشہور جنگیں لڑیں (جو تاریخ میں ایک خاص نام سے مشہور ہیں) لیکن پھر بھی یہ علاقہ مسلمانوں کے پاس ہی رہا۔ ۱۹۱۷ء میں یہاں جنرل ایلن بی کی قیادت میں انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ برطانوی اقتدار کے تحت اس علاقے کا رقبہ ۲ لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔ ۱۹۳۱ء میں یہاں کی آبادی ۱۰ لاکھ تھی۔ ۱۹۴۸ء میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور یہاں سے بار بار بے دخل ہونے والی قوم نے اپنی آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کا اعلان کردیا۔ ۱۹۶۷ء میں اس قوم نے عربوں سے جنگ کر کے ان کو بہت سے علاقوں سے محروم کردیا۔ ۱۹۷۳ء میں دوبارہ جنگ کے نتیجے میں عرب مسلمانوں نے اپنے علاقے واپس لے لیے۔ مسلمان اپنی باقی ماندہ سرزمین کے لیے سخت اور طویل جدوجہد کرتے رہے اور ۱۹۸۸ء میں ایک مسلم راہ نما نے آزادی کا اعلان کر

دیا۔ مارچ ۲۰۰۴ء میں مسلمانوں کی ایک اہم تحریک اور تنظیم کے سربراہ کو شہید کر دیا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی ان کے جانشین عبدالعزیز کو بھی شہید کر دیا گیا جس سے مسلمانوں میں جذبۂ آزادی مزید بھڑک اُٹھا۔ بے سروسامانی اور کسمپرسی کے باوجود آزادی کی یہ طویل جدوجہد توانا عزم کے ساتھ مسلمان بچے بچے میں گھر کیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے زیرِ انتظام علاقے انتہائی ظلم و جبر کا شکار ہیں۔

سوالات:

☆.....اس متنازعہ سرزمین کا نام کیا ہے؟

☆.....یہاں سے بار بار بے دخل کی جانے والی قوم کس نام سے مشہور ہے؟

☆.....عیسائیوں نے یہاں کون سی مشہور جنگیں لڑی ہیں؟

☆.....مسلمانوں کی اس سرزمین سے جذباتی وابستگی کی وجہ کیا ہے؟

☆.....۱۹۸۸ء میں آزادی کا اعلان کرنے والے اور ۲۰۰۴ء میں شہید ہونے والے دو عظیم راہ نماؤں کے نام کیا ہیں؟

کوپن تاریخ کی کھوج (۳)

نام _____

کلاس _____ فون _____

پتہ _____

_____

ای میل _____

ہدایات

☆..... پچھلے صفحہ پر دیئے گئے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆..... انعام پر خوب سوچ سمجھ کر نشان لگائیے گا۔ (لیکن صرف ایک پر)

☆..... نیچے دیئے گئے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆..... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کریں۔

☆..... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆..... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتہ: F-206 سلیم ایونیو، بلاک B-13 گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 021-4976468

ای میل: monthlysathee@hotmail.com

جوابات

۱ _____

۲ _____

۳ _____

۴ _____

۵ _____

تاریخ کی کھوج

سلسلہ نمبر ۱

درست جوابات:

۱) یوسف بن تاشفین

۲) الفانسو

۳) جنگِ زلاقہ

۴) مراکش

۵) ولادت ۱۰۰۶ء، وفات ۱۱۰۶ء

(روایات میں ولادت اور وفات کے بارے میں ذرا سا اختلاف موجود ہے)۔

بذریعہ قرعہ اندازی پانچ درست جوابات دینے والے انعام یافتگان

ماہ جبین (حیدرآباد)

عمار اقبال (کراچی)

فاطمہ نعیم (کراچی)

احسان دانش (ٹنڈو آدم)

ماریہ عندلیب (کراچی)

ان ساتھیوں نے بھی اچھی کوشش کی:

حافظہ حفصہ صدیقی (کراچی)، سلویہ قاضی (گلشنِ اقبال)، اقبال احمد (لاڑکانہ)، عمیرہ نایاب (نارتھ ناظم آباد)، عبدالجبار (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، اقرا (لاڑکانہ)، عبدالرزاق (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، زوہیب یوسف (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، علینہ کنول (کراچی)، حسن صدیق (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، صبیہ حسن (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، بسمہ (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، شہزاد

(ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، گلناز (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، سائرہ لیاقت راجپوت (موسانی)، کوثر پروین (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، ریما (کراچی)، کامران (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، یاسمین (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، شاہ میر شاہ (کراچی)، کومل (ریڑھی گوٹھ)، مسکان (بن قاسم)، خوشنما ممتاز (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، علیزا شاہ (ریڑھی گوٹھ)، طیب (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، عبدالرحمٰن (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، بسمہ احمد (ہلال پبلک سکول ریڑھی گوٹھ)، ثمینہ عثمان (ہلال پبلک سکول)، فیصل (لانڈھی)، سنبل (کراچی)، شفیقہ (کراچی)، مہرالنساء (ریڑھی گوٹھ)، سویرا لیاقت علی (بن قاسم ٹاؤن)، رحیمہ (ہلال پبلک اسکول)، عرفان (ہلال پبلک اسکول)، سعدیہ (بن قاسم ٹاؤن)، سیما (کراچی)، سمیع اللہ خان (سخی حسن)، اسامہ طٰہٰ (لاہور)، شرجیل عباسی (جھنگ)، عبدالصمد (گجرات)، حق داد حمزہ زئی (لورالائی)، عمار جاوید (کراچی)، عدنان اقبال (راولپنڈی)، محمد عارف (لورالائی)، وکیل الرحمٰن (لورالائی)، عمیر خان (کراچی)، اسامہ سعید (کراچی)، اشرف خان (پشاور)، حیدر علی شاہ (ٹنڈو جام)، عروبہ رضوی (کراچی)، محمد ابراہیم (سکھر)، محمد علی (سکھر)، انس جاوید (کراچی)، ماہ نور خان (کراچی)، افشاں محمود (کراچی)، منیبہ اکمل (کراچی)، انس حسین (کراچی)، یمنہ عابد (کراچی)، رقیہ ابراہیم (کراچی)، وارث شاہ (جھنگ)، عبدالصمد خان (لاہور)، فیصل عابد (راولپنڈی)، شیخ یونس (گجرات)، سمیع اللہ (پشاور)، امام علی (اسلام آباد)، فیضان قیوم (ملتان)، ثمینہ احمد (بہاولپور)، واحد بلوچ (کراچی)، عمار احمد (سکھر)، فائزہ شیخ (کراچی)، عارف اللہ (کراچی)، مجتبیٰ احمد (سکھر)، بتول فاطمہ (شیخوپورہ)، عزیز اللہ (پشاور)، معاذ احمد (کراچی)، طفیل محمد (راولپنڈی)، عاصم ممتاز (کراچی)، راشد علی (اسلام آباد)، وقار عزیز (لاہور)، شمس الحق (راولپنڈی)، افشاں نوید (سکھر)، سلطانہ خان (اٹک)، باقر رضا (جھنگ)، حیدر مصطفیٰ (فیصل آباد)، امجد بھٹی (لاہور)، صائمہ فاروق (سیالکوٹ)، حسنین شاہ (کوئٹہ)، عاطف حماد (کراچی)، اسداللہ (سیالکوٹ)، سعد حسن (لاہور)، سعد ارشاد (حیدرآباد)، عزیر فاروق (کراچی)، حرا سمیع (لاہور)، حنا فیض (لاہور)، رابعہ وسیم (حیدرآباد)۔

بتعاون اکیڈمی بک سینٹر

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔فون:۳۶۸۰۹۲۰۱(۲۱۔۹۲)

برقی پتا:irak.pk@gmail.com، ویب گاہ:www.irak.pk

یوسف بن تاشفین

عبدالصمد بہٹی

یوسف بن تاشفین.....نسیم حجازی کے ناولوں کا مطالعہ کرنے والے یقیناً اس نام سے واقف ہوں گے۔ یوسف بن تاشفین مراکش کے جنوب میں رہنے والا ایک نوجوان تھا۔ یوسف بن تاشفین نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے صحرائے اعظم اور اس کے جنوب میں خاندانِ مرابطین کی حکومت قائم کی اور بعدازاں اسے اندلس تک پھیلا دیا۔ یوسف بن تاشفین نے صحرائے اعظم میں رہنے والے نیم وحشی اور حبشی باشندوں سے کئی سال تک لڑائیاں لڑیں اور اپنی حکومت دریائے سینی گال تک بڑھادی۔ یہ لوگ ان وحشی قبائل میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے بے شمار بربروں اور حبشیوں کو مسلمان بنایا۔ تبلیغ کا یہ کام، یوسف بن تاشفین کے چچا عبداللہ بن یٰسین کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ عبداللہ بن یٰسین نے اس مقصد کے لیے دریائے سینی گال کے کنارے اپنا مرکز بنایا تھا۔ شروع میں یوسف بن تاشفین اس کام میں اپنے چچا کے ساتھ تھا۔ بعد میں یوسف بن تاشفین نے شمال کا رخ کیا اور مختلف شہروں کو فتح کرتے ہوئے وہیں مراکش شہر کی بنیاد ڈالی۔

۱۰۸۲ء میں عیسائی بادشاہ الفانسو ششم نے طلیطلہ سے اپنی تاریخی فتوحات کے سفر کا آغاز کیا۔ نااہل مسلم حکمرانوں میں اسے روکنے کی ہرگز صلاحیت نہیں تھی۔ ۱۰۸۵ء میں اس نے بنوامیہ کے دور کے دارالحکومت طلیطلہ پر قبضہ کرلیا۔ شہر کے عظیم باسیوں نے ۵ سال تک عیسائیوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی لیکن بالآخر ہمت ہار بیٹھے۔ عیسائی بادشاہ

کا اگلا ہدف سرغوسہ کی کمزور ریاست تھی۔ مسلم حکمرانوں کی نااہلی کے مکمل ادراک کے بعد علما نے شمال مغربی افریقا میں مسلم امیر یوسف سے رابطہ کیا اور ان سے اندلس کی ڈوبتی ہوئی مسلم ریاست کو بچانے کا مطالبہ کیا۔

۱۰۸۶ء میں عیسائی بادشاہ الفانسو نے ''اشبیلیہ کے شمال میں ''زلاقہ'' کے مقام پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ ایک سخت لڑائی کے بعد یوسف بن تاشفین نے الفانسو کو شکست دی۔ قشتالہ کے بادشاہ الفانسو ششم کو ۸۰ ہزار شہسواروں، ۱۰ ہزار پیادوں اور ۳۰ ہزار کرائے کے عرب فوجیوں کی خدمات حاصل تھیں۔ جبکہ یوسف کی فوج بیس ہزار کے قریب تھی۔ ۲۰ ہزار مسلم افواج میں شامل ۱۲ ہزار بربر (۱۰ ہزار شہسوار اور دو ہزار پیادہ) بہترین جنگجو تھے جبکہ مقامی فوج ۸ ہزار شہسواروں اور پیادہ پر مشتمل تھے۔ دونوں سپہ سالاروں نے جنگ سے قبل پیغامات کا تبادلہ کیا۔

جنگ ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء بروز جمعہ صبح سورج نکلتے وقت الفانسو کے حملے کے ساتھ شروع ہوئی۔ یوسف نے اپنی فوج کو تین دستوں میں تقسیم کیا۔ پہلے دستے کی قیادت عباد ثالث المعتمد کر رہا تھا جبکہ دوسرے دستے کی قیادت خود یوسف بن تاشفین نے کی۔ تیسرا دستہ سیاہ فام باشندوں پر مشتمل تھا اور یوسف نے اس دستے کو آرام دیا۔ دوپہر تک المعتمد کی افواج ہی الفانسو کا مقابلہ کرتی رہیں اس کے بعد یوسف بن تاشفین اپنی فوج سمیت جنگ میں داخل ہوا اور الفانسو کی افواج کا گھیراؤ کر لیا جس پر عیسائی افواج میں افراتفری پھیل گئی اور یوسف نے سیاہ فام باشندوں پر مشتمل تیسرے دستے کو حملے کا حکم دے دیا جس نے حملہ کر کے جنگ کا فیصلہ مسلم افواج کے حق میں کر دیا۔ مسلمانوں کی فیصلہ کن فتح کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۶۰ ہزار کے عیسائی لشکر میں سے ۵۹ ہزار ۵۰۰ اس جنگ میں ہلاک ہوئے جبکہ عیسائی بادشاہ الفانسو زندہ بچ گیا تاہم اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔ جنگ زلاقہ سے عیسائیوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور یوسف بن تاشفین نے اندلس کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو سلطنت مرابطین میں شامل کر لیا۔

اس میدانِ جنگ کو زلاقہ کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''پھسلتا ہوا میدان''۔ معرکے کے روز اس قدر خون بہا کہ افواج کو قدم جمانے میں مشکل ہونے لگی۔ اس تاریخی فتح کے نتیجے میں اگلے ۳۰۰ سال تک اسپین میں مسلم حکومت موجود رہی۔

اس جنگ کو صلیبی جنگوں کے آغاز کی اہم ترین وجہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں شکست کے بعد ہی عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر جارحیت کے سلسلے کا آغاز کیا۔ ان صلیبی جنگوں کا جواب بعد ازاں صلاح الدین ایوبی نے دیا۔

آپ کی نگارشات

"آپ کی نگارشات" میں حصہ لینے والے اپنی کہانیاں، مضامین، نظمیں ہمیں روانہ کر سکتے ہیں۔ ضروری نوک پلک کے بعد آپ کی نظم/تحریر کو شائع کیا جائے گا۔

☆ تحریر پانچویں جماعت تک کے طلبہ بھیج سکتے ہیں۔

☆ نظم بھیجنے کے لیے عمر یا جماعت کی کوئی قید نہیں۔

☆ اپنی نگارشات کے ساتھ اپنی ایک عدد تصویر بھیجیں جسے تحریر/نظم کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

بچوں کی من پسند چاکلیٹ

فصیح الرحمٰن

اگر ہم بات کریں بچوں کی من پسند چیز کی تو اس میں سب سے پہلے چاکلیٹ آتی ہے لیکن دن بھر چاکلیٹ چبانے والے اکثر بچوں کے لیے بھی یہ حیرت کی بات ہوگی کہ چاکلیٹ دراصل درختوں پر اُگتی ہے اور نہ ہی یہ ان ٹافیوں جیسی نظر آتی ہے جو ہم عموماً ڈکانوں سے خرید کر کھاتے ہیں۔

Coffee beans کافی بینز یہ وہ بیج ہیں جن سے چاکلیٹ بنتی ہے لیکن ان بیجوں کو پانا اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ یہ صرف ایک ہی طرح کے درخت پر اُگتے ہیں اور یہ درخت گرم آب وہوا اور بہت ہی گرم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ چاکلیٹ کہاں اور کیسے بنتی ہے؟ تو اس کی تیاری کا طریقہ بھی دلچسپ ہے۔

چاکلیٹ بنانے کے لیے پہلے Coffee Beans کو درختوں سے توڑ کر خشک کر لیا جاتا ہے پھر ان کو بڑے جہازوں کے ذریعے کارخانوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں چاکلیٹ کے بیجوں کو گرم بھٹی پکا کر اس میں دودھ شامل کر کے چینی ڈالی جاتی ہے۔

تب جا کر چاکلیٹ ٹافیوں جیسی موجودہ شکل میں آتی ہے جو بچے، بڑے شوق اور مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔

میرے دیس کے سارے بچو!

نیاز خان اعوان

اچھے بچو پیارے بچو
میرے دیس کے سارے بچو
محنت صبح وشام کرو تم
اپنے وطن کا نام کرو تم
ہاتھوں میں کتابیں لے لو
علم وادب کی باتیں لے لو
اے مستقبل کے معمارو!
اپنے وطن کو خوب سنوارو

مشکل کیس

شیخ حسن طارق

فیضان طارق ایک پولیس انسپکٹر تھے جو بہت ایماندار تھے۔ انھوں نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ وہ ہر پیچیدہ کیس کو حل کرلیا کرتے۔ مگر اس کیس نے انھیں پریشان کر رکھا تھا۔ ہوا یوں کہ شہر کے ایک رئیس کے گھر میں ڈاکا پڑا تھا اور ملزمان فرار ہو گئے تھے۔ یہ مسئلہ بھی پولیس چیف نے انسپکٹر فیضان کے سپرد کر دیا۔ یہ حکم ملتے ہی انسپکٹر صاحب نے اپنے ساتھ کچھ کانسٹبل لیے اور جیپ میں جائے وقوعہ کی طرف چل پڑے۔ اچانک ان کی جیپ پنکچر ہوگئی۔ ابھی وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے کہ انھیں ایک بچہ دکھائی دیا جو ایک گھر میں جا رہا تھا انسپکٹر کو اچانک کیا سوجھی کہ وہ اس کا پیچھا کرنے لگے۔ وہاں سے دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں جہاں بچہ گیا تھا۔ انھوں نے کانسٹبل کو اشارے سے بلایا اور اسے بتایا کہ مجھے اس گھر سے مشکوک آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔" انھوں نے سنا "بس تم باس تک یہ بات پہنچا دو یہ جو سال لوٹا ہے وہ تمھیں دیں گے۔" انسپکٹر نے فوری طور پر وائرلیس پر پولیس کی بھاری نفری بلالی۔ پولیس نے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ میگافون سے انسپکٹر فیضان نے اعلان کیا " خبردار! ہاتھ اوپر اٹھا دو اور ہتھیار پھینک دو تم لوگ ہمارے گھیرے میں ہو۔" یہ اعلان سنتے ہی گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ پولیس نے گھر میں موجود ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔ ابھی وہ مزید تلاشی لے ہی رہے تھے کہ اچانک انھیں ایک تہہ خانہ نظر آیا۔ انھوں نے دیکھا تو وہاں بیس پچیس بچے تھے۔ گویا اس گروہ نے ان بچوں کو اغوا

کرلیا تھا۔'' گرفتار گروہ سے تفتیش کے بعد پتا چلا کہ انھوں نے سارا حال زمین میں دبا دیا تھا۔ جب زمین کھودی گئی تو مال بھی مل گیا۔

انسپکٹر فیضان جب تھانے پہنچے تو ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ انھوں نے بہادری کا ایوارڈ بھی محکمے کی جانب سے وصول کیا۔

☆.....☆

بسم اللہ کی برکت

بشریٰ صدیقہ وسیم

بسم اللہ کی برکت سے آسان ہوگا ہر اک کام
بسم اللہ کی برکت سے تم ہو گے نہ ہرگز ناکام
ہر اک کام سے پہلے بسم اللہ جو پڑھ لی تم نے
پھر اس کام کا غم مت کرنا وہ اللہ کے ذمے
جب بھی کوئی مشکل آئے لو اللہ کا نام
مشکل وقت گزر جائے گا ہمت سے لو کام
باجی بھیا امی ابو سب کو یاد دلائیں
بسم اللہ پڑھ کر ہم اپنے کاموں کو نمٹائیں
پیارے نبی کی پیاری باتیں سیکھیں اور سکھائیں
خود بھی بچیں شیطان کے شر سے اوروں کو بھی بچائیں

☆.....☆

تتلی ہوں میں

ا۔ش

تتلی ہوں میں تتلی ہوں میں
اچھی ہوں میں سچی ہوں میں
پتا پتا ڈالی ڈالی
پھولوں میں ہوں رہنے والی
رس پھولوں کا پیتی ہوں میں
رس پی کے ہی جیتی ہوں میں
تول بھی پورا تول رہی ہوں
ہر دم رب رب بول رہی ہوں
پھولوں سے ہی شان ہے میری
اس دھرتی میں جان ہے میری
پاک وطن کا ہر اک گلشن
پاک وطن کا ہر اک آنگن
مولا ہر دم قائم رکھنا
مولا ہر دم دائم رکھنا
رونق ہوں میں ہر گلشن کی
امجد چاہت ہوں ہر من کی

گاؤں کے رنگ نرالے

ضیاء اللہ محسن

چلو چلتے ہیں ہم گاؤں میں
بیٹھیں گے ٹھنڈی چھاؤں میں

جہاں چڑیا بلبل چہک رہے
جہاں گل بوٹے سب مہک رہے

جہاں کوئل کوکو گاتی ہے
نغمے وہ خوب سناتی ہے

جہاں پیڑ تلے ٹھنڈے سائے
سائے میں بیٹھے چوپائے

جہاں ہر اک ریت نرالی ہے
ہر سمت بچھی ہریالی ہے

جہاں شبنم باغ بہاریں ہیں
پیڑوں کی خوب قطاریں ہیں

وہاں پیپل ،برگد جھوم رہے
اور اُجلی فضا کو چُوم رہے

جہاں سندر سندر ہیں سپنے
سب لوگ دکھائی دیں اپنے

جہاں ٹھنڈا میٹھا پانی ہے
کینو ، امرود ،خوبانی ہے

گاجر ہے ، آلو اور بھنڈی
لو پیاز ،ٹماٹر اور گوبھی

وہاں نہریں ،ندیاں، نالے ہیں
گاؤں کے رنگ نرالے ہیں

چوتھا پڑاؤ

ایک الگی کے کارخانے میں

قاضی مظہر الدین طارق

بچو! میں پانی کا ایک سالمہ (مولیکیول) ہوں، اپنے سفر کی کہانی سنا رہا ہوں۔

جب میں سمندر میں گھومتا گھومتا تھک گیا تو یہاں موجود کائی (سپائیروگائیرا) کے ایک خلیے میں داخل ہونے کا سوچا.....

میں نے دیکھا.....اس کے اطراف ایک نرم ریشمی غلاف (میوسلیج) تھا.....اس کو ٹٹول ٹٹول کر اندر گیا، تو ایک سخت دیوار (سیل وال) تھی.....میں پریشان ہو گیا، اب کہاں جاؤں.....مایوس ہو کر لوٹنے ہی لگا .....تو اچانک ایک کھلا دروازہ نظر آیا.....اندر داخل ہو گیا۔

آگے چند قدم ہی بڑھا تھا کہ ایک اور دیوار (سیل ممبرین) نظر آئی، شکر ہے اس کا دروازہ جلد ہی مل گیا.....مگر بند تھا.....میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی، ایک خوفناک محافظ باہر آیا اور آتے ہی سولات کی بوچھاڑ کر دی.....''کہاں سے آئے ہو؟''

''کیا لے کر آئے ہو؟''

''کیوں؟ کس لیے آئے ہو؟''.....میں نے خوفزدہ ہو کر کہا''آسمان سے آیا ہوں.....نہیں! کچھ نہیں لایا.....میں تو گھومنے پھرنے نکلا تھا.....اس سفر کی کہانی بچوں کو سنانے.....تاکہ وہ ربّ تعالیٰ کی نشانیوں سے واقف ہوں اور اُس کا شکر ادا کریں!''

اس نے کہا''ٹھہرو! میں سردار سے پوچھتا ہوں!''اس نے فون پر بات کی.....اور دروازہ کھول دیا اور کہا''وہ کہہ رہے ہیں تم کو اندر آنے دوں!''

ڈر نکل چکا تھا، اب سوالات کی باری میری تھی.....میں نے پوچھا''بھائی! باہر یہ نرم نرم غلاف، ایک دیوار پھر دوسری دیوار اور یہ دروازے کیسے؟''.....وہ خُرش روئی سے بولا''میں کیا جانوں سردار (مرکزے) سے پوچھنا!''

''اچھا تو مجھے سردار کے پاس لے چلو!''وہ پھر اسی طرح بولا''تم خود جاؤ! دیکھتے نہیں ہو! میں تو یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا، آنے جانے والوں کو چیک کرنے کی سخت ڈیوٹی ہے!''.....''اچھا! رستہ تو بتا دو؟''.....کوئی جواب نہ ملا۔

میں خود ہی آگے بڑھا..... خوشی کی انتہا نہ رہی..... اپنے جیسے جاننے والے جو مل گئے، میرے جیسے بہت سے سالمے (مالیکیول)، پانی کے سالمے..... مگر یہ لوگ بڑے خوف زدہ لگ رہے تھے، اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

میں نے ایک کو روک کر پوچھا ''بھائی اس قدر خوف کی کیا وجہ ہے؟''

اس نے کہا ''تم نہیں جانتے کیسی خطرناک جگہ آگئے ہو!'' میں نے پوچھا ''کیسا خطرہ!؟ میں تو دنیا گھومنے نکلا ہوں تاکہ اس سفر کا احوال بچوں کو سناؤں اور ربّ العالمین کی نشانیوں اور کمالات سے ان کو واقف کروں!''

اس نے کہا ''مقصد تو نیک ہے..... مگر خطرہ بہت!!!''

میں نے کہا ''مجھے بھی بتاؤ کیا خطرہ بہت ہے؟''

''چار طرف نظر دوڑاؤ..... خطرہ خود نظر آ جائے گا!''

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا آپ ہی بتادو!؟'' ٹھنڈی آہ بھری اور اشارہ کرکے کہا ''یہ چار طرف دیکھ رہے ہو، ہمارے درمیان کیا کیا گھوم رہا ہے!''..... پھر خود ہی کہا ''یہ گلوکوز ہے، وہ لحمیے (پروٹین) ہیں اور یہ دیکھو یہ چکنائیاں (لپڈز) ہیں..... جانتے ہو یہ سب کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے گھبرا کر کہا ''نہیں! آپ بتائیں؟'' رازداری سے کہا ''یہ ہم پانی کے سالموں کو مار توڑ کر اور دوسرے بڑے سالموں میں پرو کر قیدی بنائے گئے ہیں!''.....

''اُوہ! اب میں سمجھا، پریشانی کیسی ہے!..... مگر میں تو اس گھمنڈ میں تھا کہ میں ہر جگہ جاسکتا ہوں، مجھے کہیں کوئی خطرہ نہیں، آگ میں بھی نہیں!'' بولا ''بچو دو! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے..... ہزاروں ایسی جگہیں

ایک الجی (سپائیروگائیرا) کا اندرونی منظر

ہیں جہاں ہمارے آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے..... بلکہ ہمارے الیکٹرونز کو چھین لیے جاتے ہیں اور ہم کو ایک بڑے سالمے کا حصہ بنا کر ایک عرصے کے لیے قید کر دیا جاتا ہے!'' میں واقعی پریشان ہو گیا۔

مگر پھر میں نے سوچا خطرہ مول نہ لوں تو زندگی کیسی؟ ہمت نہ کی تو میرا عظیم مقصد کیسے پورا ہو گا؟ میں تو وہاں تک جاؤں گا جہاں تک جا سکتا ہوں..... تف ہے!..... ڈرنے سے تو موت بہتر ہے!!!

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا شروع کیا..... ایک اور بھائی سے پوچھا ''بھائی یہ کون سی جگہ ہے؟'' بولے ''یہ نحر مایا (سائٹو پلازم) ہے!''

وہ بھائی تو بھاگ گئے دوسرے سے پوچھا ''بھائی! مرکزے سے ملنا ہے، اس کیلئے قریب ترین محفوظ راستہ کون سا ہے؟'' انہوں نے ایک تنگ راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں آگے بڑھتا گیا..... تنگ راستے میں چلتے چلتے تھک گیا۔

ایک اور کو روک کر پوچھا ''بھائی! یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ بولے ''یہ سائی ٹو پلا سمک اسٹرینڈ ہے، اس کے آخر میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں ہمارے سردار 'مرکزے' (نیوکلیس) تشریف فرما ہیں!''

''یہ اسٹرینڈ کیا ہے؟'' بولے ''ایسے کئی اسٹرینڈ ہیں جنہوں نے چاروں طرف سے بڑے خالیے (ویکیول) کے درمیان مرکزے کو سنبھال رکھا ہے۔''

''مگر یہ مرکزہ ہے کتنی دور؟''..... ''وہ ابھی بہت دور ہے'' یہ کہتے ہوئے چل دیا۔

میں چلتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک کھلی جگہ پہنچا۔ وہاں سامنے چمکتا ہوا 'مرکزہ' نظر آیا..... جیسے آج کل حرم کی طرف جاتے ہوئے چاروں طرف عمارتیں ہی عمارتیں ہیں..... مطاف میں پہنچتے ہی اچانک کعبہ نظر آتا ہے۔

منزل سامنے دیکھ کر ایسا سکون آیا کہ آنکھ ہی لگ گئی.....!!!

کسی نے گدگدایا..... تو آنکھ کھل گئی..... ہڑبڑا کر اُٹھ گیا..... پتہ ہی نہیں چلا کتنی دیر سویا رہا۔

چاروں طرف نظر دوڑائی..... مرکزے کی دو دیواروں والی 'مرکزائی غشا' (نیوکلیئر انولپ) میں بھی دروازے تھے اور چوکیدار بھی نگرانی پر مستعد تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت پیدا کی اور ایک دروازے پر دستک دی اور کہا ''السلام علیکم''..... چوکیدار نے ''وعلیکم السلام!'' کہا پھر نرمی سے پوچھا ''کیا یہاں تک آنے کے لیے سردار سے اجازت لی تھی؟'' میں نے کہا ''ہاں!'' کہنے لگے ''مگر ٹھہرو! یہاں سے اندر جانے کی اجازت

لینا بھی ضروری ہے!''

میں جواب کا انتظار کر رہا تھا..... کہ چوکیدار نے پلٹ کر کہا ''وہ کہتے ہیں یہیں ٹھیراؤ!''

پردے کے پیچھے سے کوئی شبیہ نظر آئی..... پھر ایک گرجدار آواز آئی..... ''کہو! کیسے آنا ہوا؟'' پہلے تو میں ڈر گیا، پھر دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ غصے میں نہیں بلکہ ان کی آواز ہی ایسی ہے، جان میں جان آئی تو میں نے کہا ''آپ کیا کرتے ہیں اور کس سے کیا کام کرواتے ہیں؟'' بولے ''ہیں! تم جانتے ہو اس ایک جملے میں کتنے سارے سوال ہیں؟''..... میں نے کہا

''ہاں! میں بچوں کی خاطر..... آپ کے جواب کے لیے بہت لمبا سفر کر کے آیا ہوں اور اس کے لیے انتظار کر سکتا ہوں!''

وہ بولے ''اس میں میرا کچھ بھی کمال نہیں..... سب اللہ ربُ العزت کی دین ہے، اس نے ہی سب کچھ سکھایا ہے، خلیے کے اس کارخانے کو اُسی کے عطا کردہ علم کی مدد سے چلانے کا..... میں ہی ذمہ دار ہوں۔''

میں بے چین تھا، کہا ''کچھ تفصیل تو بتائیں؟'' وہ بولے ''اُس نے مجھے DNA کی صورت میں پوری کتاب لکھ کر دی ہے..... اس میں ساری ہدایات موجود ہیں کہ کس موقع پر کیا کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کیسے کرنا ہے۔'' میں پھر پوچھا ''سب کچھ ایک ساتھ لکھا ہوا ہے، تو آپ کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ کس وقت کیا کرنا ہے؟''..... کہا ''پگلے یہ بھی تو وہی بتاتا ہے!!!''

''مگر کیسے؟'' میں اب بھی مجسم سوال تھا..... بولے ''اچھا! میں ایک پیغامبر RNA اپنے DNA سے لے کر بھیج رہا ہوں، تم اس کے پیچھے جاؤ اور دیکھو یہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے!''

میں اس پیچھے کے چلا..... مجھے گمان ہوا کہ شاید یہی تھا جس نے مجھے اُٹھایا تھا۔

اب پھر ایک لمبا سفر درپیش تھا، بہرحال میں RNA کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا خلیہ کے آخری سرے پر پہنچا۔ میں نے پوچھا ''بھائی! آپ کیا کرنے جا رہے ہو؟'' انھوں نے کہا ''میں ایک 'رائبوسوم' کے کارخانے میں جا رہا ہوں جہاں سردار کے پیغام کے مطابق ایک لحمیہ بنواؤں گا..... مگر خبردار تم دور سے دیکھنا کہیں وہ تم کو بھی اس لحمیے میں پرو کر لمبے عرصے کے لیے قید نہ کر دے۔''

میں ڈر گیا ''یہ تو بہت سارے ہیں! یہ اور کیا کرتے ہیں؟'' کہنے لگے یہ خامرے (enzymes) اور راصیات (hormones) بناتے ہیں!'' میں نے پھر پوچھا ''یہ! یہ سب کیوں بناتے ہیں..... بولے ''چلو واپس چلیں، سردار ہی بتائیں گے!'' پھر وہی لمبا سفر چل چل کر تھک گیا..... میں نے ہی یہ کام اپنے سر لیا ہے، اب کرنا ہی پڑے گا۔

ہم وہاں پہنچے تو سردار نے کہا "میں نے تمہارا سوال سن لیا......ہم کو اپنی نشوونما، عملیات اور نسل آگے بڑھانے کیلئے مختلف کمیات (جیسے خامروں رامعنوں) کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ رب العٰلمین کے دیے ہوئے علم سے ہم یہ کام کرتے ہیں!"

"اس کام کو کرنے کے لئے آپ توانائی کہاں سے اور کیسے حاصل کرتے ہیں؟"......انہوں نے کہا "میں اپنے ایک عضوچے 'مائیٹوکونڈریا' میں گلوکوز کو آکسیجن کی مدد سے جلا کر کیمیائی توانائی حاصل کرتا ہوں......" میں جھٹ بول پڑا "یہ کیمیا بھی آپ کو ہمارے رب نے سکھائی ہے؟"......وہ ذرا تلخی سے بولے "اور نہیں تو وہ کون ہے! اس کے سوا میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں!"

میں نے پھر پوچھا "یہ آکسیجن، پانی اور گلوکوز آپ کو کہاں سے ملتے ہیں؟" بولے "پہلے تو یہ سب مجھے اپنے ماں باپ سے ملا......پھر رب کریم نے خود مجھے گلوکوز اور دیگر غذائیں بنانے کی کیمیا سکھائی...... آکسیجن اور پانی میں نے اپنے ماحول سے لیا، ہم اپنی ضرورت سے بہت زیادہ بناتے ہیں، اور اپنے بڑے خالیے میں جمع کرتے رہتے ہیں!......"

میں نے پھر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولے "میں بھی تو بتا رہا ہوں......رب تعالیٰ نے مجھے ایک سبز عضوچہ 'کلوروفل' نام سے دیا ہے یہ مختلف معدنیات اور پانی اپنے اطراف سے لیتا ہے اور سورج کی روشنی سے توانائی لے کر گلوکوز اور دیگر غذائیں بناتا ہے، اس کیمیا کے نتیجے میں پانی سے آکسیجن الگ ہو کر دوسرے جانداروں کے کام آتی ہے............!"

میں پریشان ہو کر بولا "اس کا مطلب مجھے اس سبز عضوچہ سے دور رہنا چاہیے...... ورنہ یہ مرے سالمے کے پرخچے اُڑا دے گا!!!"

انہوں نے کہا "پھر تم بیچ میں بولے......اور سنو! اگر رب رحیم نے مجھے یہ عضوچہ نہ دیا ہوتا یہ کیمیا نہ سکھائی ہوتی تو دنیا کی ساری مخلوق بھوک سے مرجاتی!"

میں پھر چونک گیا "وہ کیسے؟" کہا "ہم ضیائی تالیف فوٹوسنتھیسس (Photo nthysis) کرنے والے 'نباتات' زمین پر غذا اور فضا میں آکسیجن مہیا کرنے کا یہ کام نہ کرتے تو دوسرے جاندار جو اپنی غذا نہیں بنا سکتے وہ کیا کھاتے؟"

ارے! ارے! یہ کیا ہوا............ایک مچھلی آئی...... اور ہم کو کھا گئی......!

مرتے مرتے اُن کے آخری الفاظ تھے "میں مظلوم ہوں نہ ناراض......میں خوش ہوں کہ میرا رب مجھ سے وہ کام لے رہا ہے......جس کے لیے اس نے مجھے پیدا کیا......کسی اور کی زندگی کے لیے مجھے اُس کا رزق بنایا......!" اور میں سوچ رہا تھا کہ اِس مچھلی کے پیٹ سے میں کہاں جاؤں!!!

☆......☆......☆

شرارتی بھوت

نورین ایمان

رات کو گھپ اندھیرے میں دروازے کی کنڈی بج رہی تھی

بچپن سے ہی ہمیں شرارتی بھوت کے لقب سے نوازا گیا تھا..... بھوت شاید ہمارے بکھرے بکھرے، اجڑے اجڑے گھونسلا نما بالوں کی وجہ سے اور شرارتی ہمارے نت نئے ہنگاموں کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے تیسری کلاس میں قدم رنجہ فرمایا تھا..... اس کے کچھ ماہ بعد گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئیں..... اب ہمارا سارا وقت گھر میں گزرتا..... گھر والوں کے ساتھ شرارتیں کرنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا..... ایک اور بات بتاتے چلیں..... ان دنوں ہمارے گھر ایک اور ڈراما چل رہا تھا..... وہ یہ کہ کوئی جن صاحب چپکے سے ہمارے گھر تشریف لائے اور کچھ نہ کچھ اٹھا کر رفو چکر ہوجاتے۔ گھر والوں کو جب بہت تلاش

بسیار کے بعد بھی مطلوبہ چیز نہ ملتی تو ان کے رنگ فق ہو جاتے.....

اب ہم کیا بتائیں کہ اس جن بھائی کے ہم پر کیا کیا احسانات ہیں.....؟ ہم نے سوچا کیوں نہ ہم بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیں..... بدنامی تو جن بھائی کو مل ہی چکی تھی..... اب ہوتا یہ کہ جن بھائی والے کام سرانجام ہم دیتے اور نام جن بھائی کا آ جاتا..... مطلب بدنام وہ ہو جاتے..... جن بھائی کی اس حرکت سے مجھے خاصہ فائدہ ہوا تھا..... خاص کر کھانے پینے کے معاملے میں۔ کسی کی چاکلیٹ پڑی ہوئی یا بسکٹ..... ہم کسی جن کی طرح نازل ہوتے (جب وہاں کوئی نہ ہوتا) اور وہ چیز اڑا لیتے..... چیز کھانے کے بعد کوئی ثبوت بھی نہ چھوڑتے.....

ایک روز آپا نے امی سے کہا ''امی! میرے بال بہت روکھے پڑے ہیں میں سوچ رہی ہوں کہ مہندی ہی لگوالوں آپ سے.....'' آپا کی بات پر امی جان بولیں۔

''ہاں ہاں..... کیوں نہیں؟''

اور قریب بیٹھے ہم نے جب یہ سنا تو ہمارا منہ بن گیا ..... کیوں کہ بچپن میں ہمیں مہندی کی خوشبو بالکل پسند نہیں تھی..... ہم تب تو خاموش رہے مگر اس کا حل بھی ہم نے ڈھونڈ لیا تھا..... آپا مہندی کا رنگ گہرا نکالنے کے لیے طرح طرح کی چیزیں مکس کر رہی تھیں..... اور ہم چپکے چپکے اس ساری صورت حال کو بچشم خود دیکھ رہے تھے.....

آپا نے بھگوئی ہوئی مہندی ایک ڈونگے میں ڈالی اور ڈونگا شیلف پر رکھ کر چلی گئیں..... آپا کے جاتے ہی ہم کچن میں کسی جن کی طرح حاضر ہوئے..... اور ڈونگا اٹھا کر سینک میں الٹ دیا اور پانی کا نل بھی کھول دیا..... جب مہندی سینک سے اچھی طرح بہہ گئی، تو ہم نے ڈونگا بھی دھو کر اسے اس کی جگہ پر یعنی شیلف پر رکھ دیا۔

بمشکل دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ پورے گھر میں مہندی غائب ہونے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی..... اب ہر کوئی سہا بیٹھا تھا کہ کہیں اب آپا کے بعد ان کی کوئی چیز غائب نہ ہو جائے..... جب کہ ہم شرارتی بھوت..... مم..... میرا مطلب مابدولت بڑے مزے سے بیٹھے اس سارے ڈرامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے..... اسی طرح سردیوں کی ایک رات تھی کہ سب کھانا کھانے بعد اپنی اپنی رضائیوں میں دبکے بیٹھے تھے..... ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے..... ہمارے ذہن میں ایک شرارت انگڑائی لی..... سب باتوں میں ایسے مگن تھے کہ کسی کو ہمارے اٹھنے کی خبر نہ ہوئی..... ہم ایک موٹا اور لمبا سا دھاگا کچن کی

کنڈی کے ساتھ باندھ کر دھاگے کا دوسرا سرا ہاتھ میں ایسے چھپا لائے کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ ہمارا دھاگے والا ہاتھ پیچھے کی طرف تھا..... اس لیے کسی کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کچھ ہی دیر میں بجلی چلی گئی..... ہم نے تکیے کے نیچے رکھا دھاگے کا سرا ہاتھ میں پکڑ لیا..... بجلی بند ہوتے ہی چونکہ اندھیرا چھا گیا تو سب رضائیوں میں منہ میں دیے لیٹ گئے..... ہم جو پہلے ہی شرارتی ہنگامے کے لیے تیار بیٹھے تھے، جلدی سے دھاگے کو ہاتھ میں پکڑا اور آہستہ آہستہ کھینچنے لگے..... کچن کی طرف سے آتی آواز سب سن چکے تھے..... مگر جیسے اچانک گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوجاتے ہیں..... ایسے ہی سب کی آواز بھی حلق سے غائب ہوچکی تھی..... اچانک ایک طرف سے آپا اور بھائی کی سانس کے ساتھ بولتی آواز سنائی دی اور پھر بند ہوگئی..... کمرے میں بالکل خاموشی تھی..... ڈر کے مارے کوئی بھی نہیں بول رہا تھا..... جب کہ ہم مسلسل جھٹکے لگانے میں مصروف تھے..... ایک گھنٹے بعد بجلی آئی تو ہم نے دھاگہ فوراً کھینچ دیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو.....

اب ہم رضائی میں منہ دیے خاموش ہنسی ہنستے رہے..... لیکن صبح ہوتے ہی جن کا راز بھی فشا ہوچکا تھا..... ہوا یہ کہ رات میں ہم دھاگا توڑنا بھول گئے..... اور وہ بندھا ہی رہ گیا..... اور ہم تک پہنچنے کا سراغ بھی دھاگے نے دیا..... کیوں کہ دھاگا بدستور ہمارے پلنگ کے پاس موجود تھا.....

اس کے بعد کیا ہوا.....؟ اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں..... لہٰذا اسی پر گزارا کریں.....

☆.....☆

ساتھی ورکشاپ برائے قلمکاران

ماہنامہ ساتھی اپنے قلمکاروں کی تحریروں میں ندرت اور جدت لانے کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف پروگرامات کا انعقاد کراتا رہتا ہے۔
گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی جنوری ۲۰۱۶ء میں 'ساتھی گائیڈنس فورم' ورکشاپ کا انعقاد کرے گا۔

ضروری نوٹ:

☆..... نشستیں محدود ہیں، اس لیے 'پہلے آیئے پہلے پایئے' کی بنیاد پر داخلہ دیا جائے گا۔

☆..... ورکشاپ کی فیس ۵۰۰ روپے ہوگی۔ جس میں نوٹس، کتابوں کی فراہمی وطعام شامل ہے۔

ورکشاپ کی تفصیلات مع ایجنڈا ہمارے فیس بک کے صفحے پر ملاحظہ فرمائے۔

www.facebook.com/monthlysathee مزید معلومات کے لیے: 0333-3718343

پچھلی ورکشاپ کے لیکچر Daily Motion پر Sathee Guidance Forum کے نام سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

فرق تلاش کریں

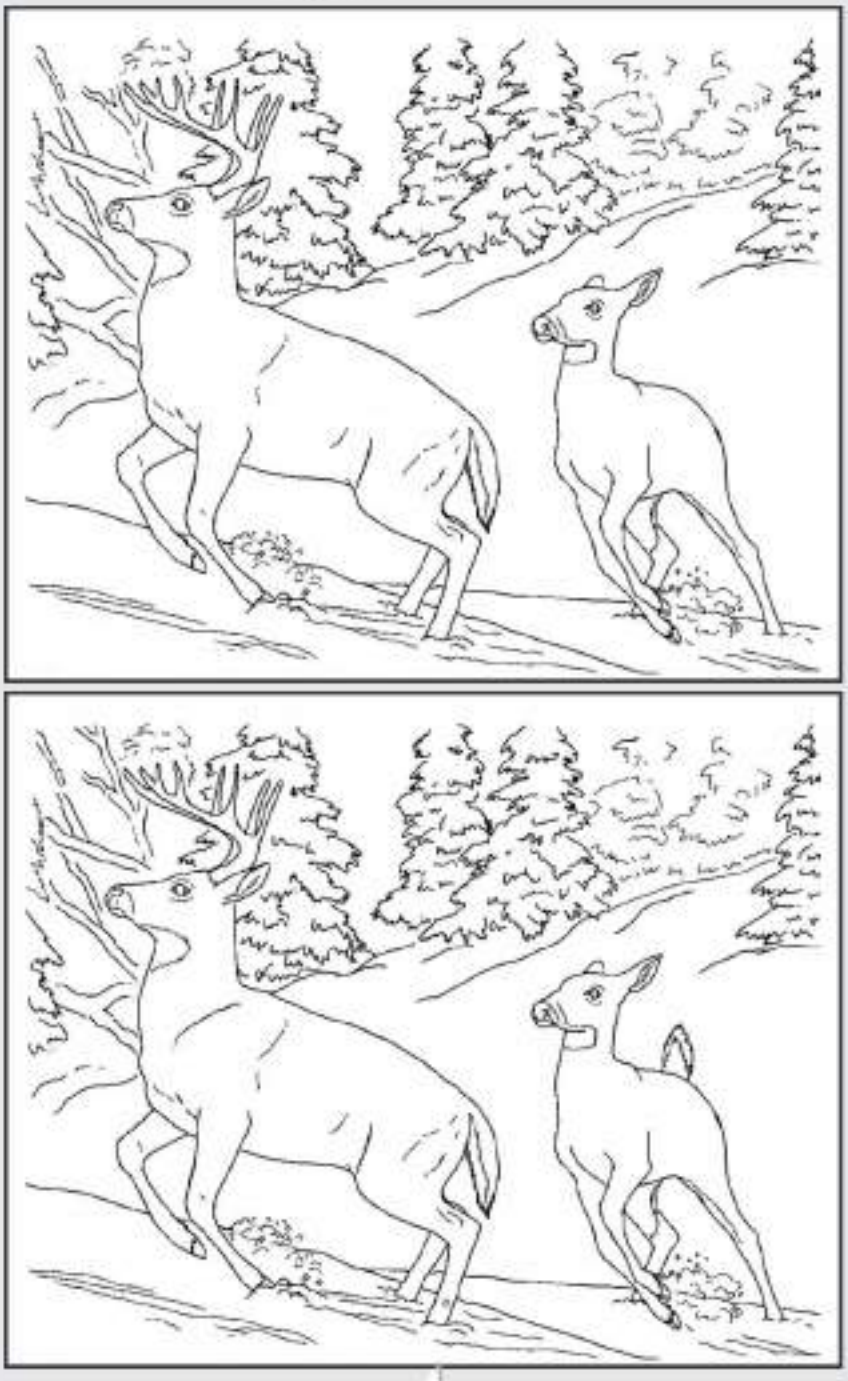

وقار محسن کی یادمیں

تحریر: پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

آہ! وقار محسن بھی جُدا ہوئے ۔اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، آمین! ایک انتہائی شفیق اور قابل انسان، جس نے اپنی ذات سے کسی کو بھی کچھ تکلیف نہ دی۔ بچوں کے ادب کے دامن کو اپنے رشحاتِ قلم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ہمدرد نونہال، ساتھی و دیگر رسالے اُن کی تحریروں سے جگمگاتے رہے، بڑی مفید اور عمدہ کہانیاں بھی لکھیں اور منظوم حکایات بھی بیان کردیں۔ وہ جاسوسی طرز کے ناولوں کو بھی تمثیلی نظم میں ڈھالنا چاہتے تھے، لیکن وقت نے مہلت نہ دی۔ وقت بہت ظالم ہے، جلد گزر جاتا ہے، وقت بہت مہربان بھی ہے، اگر نہ گزرے تو بُرے دنوں کے بعد اچھے دن کیسے آئیں؟ بس اسی دھوپ چھاؤں کا نام ''زندگی'' ہے۔

شاید ۱۶ جولائی کا دن تھا، سال یہی، یعنی ۲۰۱۵ء، کسی نے وقار محسن صاحب کے انتقال کی اطلاع دی۔ اوہو! دل دکھی ہوگیا، بہت سے لوگوں سے تو بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اب تو وقار بھائی اگلے جہاں میں ملیں گے۔ قیامت کو ملیں گے۔ مرزا غالبؔ نے لکھا:

؎ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

وقار بھائی بہت اچھے انسان تھے۔ بچوں کے عظیم رائٹر تھے۔ وہ 1944 عیسوی میں غیر منقسم ہندستان میں پیدا ہوئے۔ اُن کی پیدائش کے تین چار سال بعد پاکستان بنا۔ بھلا تین چار سال کے بچے کو کہاں کچھ یاد رہ سکتا ہے؟ وہ کیا جانے سیاست کے بکھیڑے، یہ تو بڑوں کے لوازمات ہیں۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے ہی علاقے میں حاصل کی ہوگی لیکن اعلا تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی، کراچی یونیورسٹی سے اُردو ادبیات میں ایم۔اے بھی کیا۔ یہیں کسی پرائیویٹ کالج میں شاید کچھ عرصہ تدریسی فرائض بھی سرانجام دیئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وقار محسن صاحب نے سپیریر کالج، کراچی میں کامرس بھی پڑھائی، واللہ عالم! لیکن یہ، میری یاداشتوں میں ہے کہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور یقیناً ایل ایل بی پاس کیا تھا، پھر BBA یعنی بزنس کی تعلیم بھی حاصل کی، کاروبار نہ کر سکے۔ پاکستان آکر انھوں نے ''اسٹیٹ بینک'' سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا یا سلسلہ شروع کیا، اُس کے بعد الائیڈ بینک سے وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران اُن کے دو بچے تانیہ (بیٹی) اور فیصل وقار (بیٹا) کراچی کے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وقار محسن صاحب کو ''علم'' کی اہمیت کا احساس تھا، وہ خود اور اُن کی بیگم صاحبہ بھی تعلیم یافتہ تھے، اعلا تعلیم یافتہ، انھیں پڑھنے کا شوق تھا۔ خُوب پڑھا کرتے۔

نونہالو، علم حاصل کرنے کی دُھن، جس پر سوار ہوجائے، جانو اُس کا بیڑا پار ہے۔ ہمارا گوشت پوست کا جسم تو قبر میں گل سڑ جاتا ہے لیکن ہمارا نام، ہمارے علم کی وجہ سے زندہ رہتا ہے، جو لوگ پڑھتے لکھتے ہیں، وہ کتابوں میں جگہ پاتے ہیں اور کبھی بھی نہیں مرتے۔

وقار محسن صاحب کے ساتھ لکھنے والوں میں، معروف شاعر تنویر پھولؔ اور اشرف علی بیتھوی صاحبان کے نام لے سکتے ہیں، ضیاالرحمٰن ضیاء بھی اسی دور میں تھے۔ آگے پیچھے ہم نے بھی لکھنا شروع کیا۔ البتہ مظہر یوسف زئی صاحب سینئر تھے، مسعود برکاتی صاحب تو بہت سینئر تھے۔

وقار محسن صاحب کو پھول پودوں سے بھی نہایت دلچسپی تھی۔ ہائے! ایسی مہربان اور مشفق شخصیت شب قدر یعنی ۲۹ رمضان المبارک، سال ۲۰۱۵ء ہم سے جُدا ہوگئی۔ وقار محسن صاحب وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے اور اُن کے گھر والوں اور قارئین کو صبر بھی عطا فرمائے،

آمین!!

☆.....☆

ایک دلچسپ سبق

محمد اقبال قریشی، لاہور

ایک دفعہ ایک گدھا ایک گہرے کنویں میں جا گرا اور زور زور سے رینکنے لگا۔ گدھے کا مالک کسان تھا جو کنویں کے کنارے پہ کھڑا اسے بچانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ جب اسے کوئی طریقہ نہیں سوجھا تو ہار مان کر دل کو تسلی دینے لگا کہ گدھا تو اب بوڑھا ہو چکا ہے، وہ اب میرے کام کا بھی نہیں رہا، چلو اسے یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں اور کنویں کو بھی آخر کسی دن بند کرنا ہی پڑے گا، اس لیے اسے بچا کر بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے پڑوسیوں کی مدد لی اور کنواں پاٹنا شروع کر دیا۔ سب کے ہاتھ میں ایک ایک پھاوڑا تھا جس سے وہ مٹی، بجری اور کوڑا کرکٹ کنویں میں ڈال رہے تھے۔

گدھا اس صورت حال سے بہت پریشان ہوا۔ اس نے اور تیز آواز نکالنی شروع کر دی۔ کچھ ہی لمحے بعد گدھا بالکل خاموش سا ہو گیا۔ جب کسان نے کنویں میں جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب جب گدھے کے اوپر مٹی اور کچرا پھینکا جاتا ہے تب تب وہ اسے جھٹک کر اپنے جسم سے نیچے گرا دیتا ہے اور پھر گری ہوئی مٹی پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ کسان اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر مٹی اور کچرا پھینکتا رہا اور گدھا اسے اپنے بدن سے ہٹا ہٹا کر اوپر آتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کنویں کے منڈیر تک پہنچ گیا اور باہر نکل پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر کسان اور اس کے پڑوسی سکتے میں پڑ گئے۔ ان کی حیرانی قابل دید تھی۔ اس غیر متوقع نتیجے پر وہ گدھے سے بھی بڑھ کر مجسمہ حیرت بنے ہوئے تھے۔

زندگی میں ہمارے ساتھ بھی ایسے واقعات رونما ہو سکتے ہیں کہ ہمارے اوپر کچرا اچھالا جائے، ہماری کردار کشی کی جائے، ہمارے دامن کو داغدار کیا جائے، ہمیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے لیکن گندگی کے اس گڑھے سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم ان غلاظتوں کی تہہ میں دفن ہو کر رہ جائیں، بلکہ ہمیں بھی ان بے کار کی چیزوں کو شانہ اچک کر نیچے گراتے ہوئے اوپر کی طرف اور آگے کی سمت بڑھتے رہنا چاہیے۔ زندگی میں ہمیں جو بھی مشکلات پیش آتی ہیں وہ پتھروں کی طرح ہوتی ہیں مگر یہ ہماری عقل پر منحصر ہے کہ آیا ہم ہار مان کر ان کے نیچے دب جائیں یا ان کے اوپر چڑھ کر مشکل کے کنویں سے باہر آنے کی ترکیب کریں۔ خاک ڈالنے والے ڈالتے رہیں اور بھونکنے والے بھونکتے رہیں مگر پرعزم انسان اپنا راستہ کبھی نہیں بدلتا۔

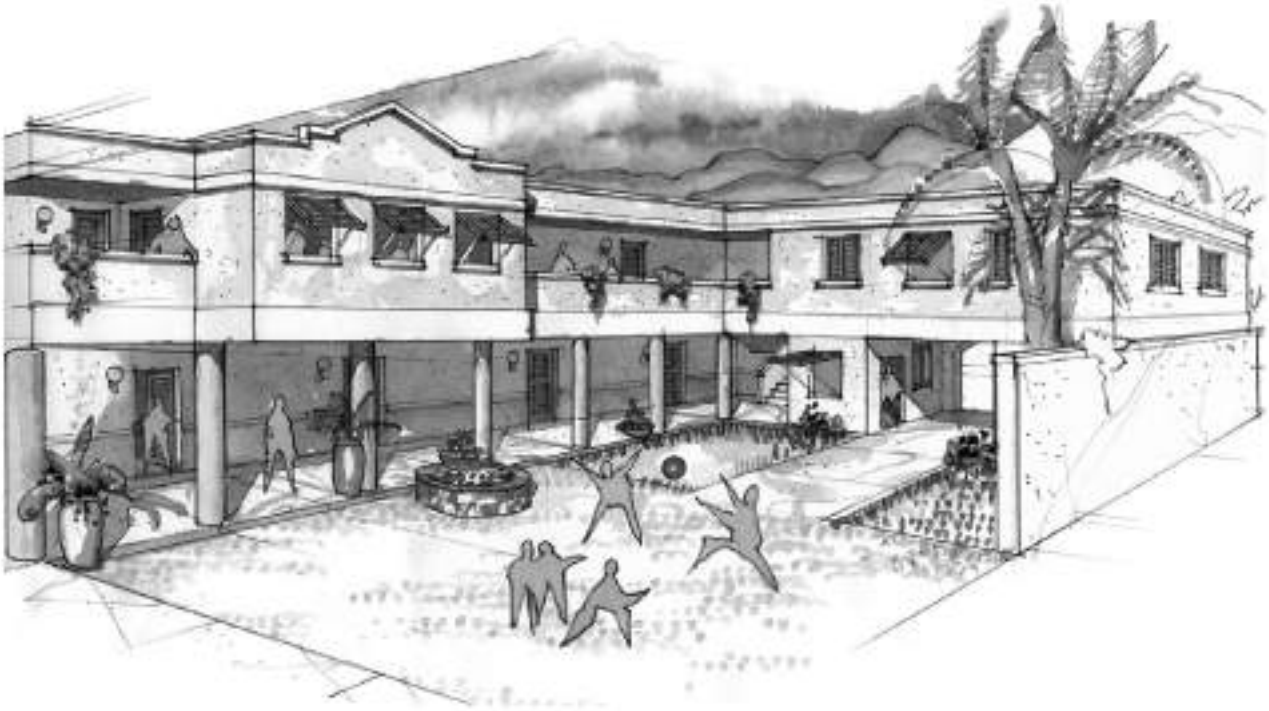

ستارے والی لڑکی

معروف احمد چشتی

مِڈّی کا دُرست نام عارفہ تھا۔ مگر سب اسے مِڈّی کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی ناک پیدائشی طور پر ایک طرف سے ذرا چپٹی تھی۔ چپٹی ناک والے کو پنجابی میں مِڈّا یا مِڈّی کہتے ہیں۔

مِڈّی بہت خوب صورت اور ذہین بچی تھی مگر اپنے اس اُلٹے نام کو پسند نہ کرتی تھی۔ کلاس کے بچے جب بھی اسے مِڈّی کہہ کر بلاتے وہ چڑ جاتی اور جھگڑنے لگتی۔ یاد رکھو دوستو، آدمی جتنا زیادہ چڑتا ہے لوگ اسے اتنا زیادہ چڑاتے ہیں۔ یہی کچھ مِڈّی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ مگر اس کو احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کی پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ایک دن مِڈّی کی آپی فائقہ نے اس سے کہا ''عارفہ، پتا ہے ٹیسٹ میں تمھارے نمبر کیوں کم آئے ہیں؟''

عارفہ چڑ کر بولی ''نہیں مجھے نہیں پتا۔ آپ نے پتا لگا لیا ہوگا؟''

فائقہ بولی ''وجہ تمھاری ناک ہے۔''

''خبردار، میری ناک کے بارے میں کچھ نہ بولنا اور ویسے بھی میری استانی لڑکیوں کی ناکیں دیکھ کر نمبر نہیں لگاتیں۔''

''میرا مطلب تھا تم اپنی ناک کی وجہ سے چڑ جاتی ہو۔

اس لیے پڑھائی پر توجہ نہیں دے پاتی۔"

"تو میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟"

"تمھیں دیکھتے ہی سب کی توجہ تمھاری ناک کی طرف چلی جاتی ہے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ تم ناک کی وجہ سے چڑتی ہو۔ اب تم کوئی ایسا کام کرو کہ تمھیں دیکھتے ہی سب کی توجہ تمھارے کارنامے کی طرف چلی جائے اور کسی کو ناک یاد ہی نہ آئے۔"

فائقہ آپی کی بات سن کر مِدّی سوچ میں پڑ گئی۔ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لے کر اوّل آئے گی مگر اس کے لیے اسے چند ماہ انتظار کرنا پڑتا اور وہ انتظار بالکل بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مِدّی جب ہر طرف سوچ کے گھوڑے دوڑا چکی تو اُکتا کر ہوم ورک میں لگ گئی۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اسی سوچ میں کئی دن بیت گئے۔ وہ کوئی منصوبہ نہ بنا سکی مگر کچھ کر گزرنے کی لگن اس کے من میں مچلتی رہی۔

وہ ۲۶ / اکتوبر ۲۰۱۵ء کا دن تھا۔ موسم بہت شفاف تھا۔ چمکیلی دھوپ پڑ رہی تھی۔ سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں اور گرمی ختم ہو چکی تھی۔ مِدّی اپنا سبق پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس کی استانی کو چکر سا آ گیا۔ وہ سر پکڑ کر گر پڑیں۔ مِدّی اپنی چند ہم جماعت کے ساتھ استانی کو اٹھانے آگے بڑھیں تو دیکھا کہ دیوار پر لٹکتا کلاک بری طرح ہل رہا تھا۔ ان کے کمرۂ جماعت کی کھڑکیاں بجنے لگیں۔ اتنے میں باہر شور سنائی دیا۔ "زلزلہ آ گیا، زلزلہ آ گیا۔" اب مِدّی کی سمجھ میں آیا کہ اس کی استانی کو چکر کس وجہ سے آیا تھا۔ سب لڑکیاں باہر کو دوڑیں۔ سکول کے میدان میں سارا سکول اکٹھا ہو چکا تھا۔

اچانک ایک دھماکے سے سکول کا ایک کمرا دھڑام سے گر گیا۔ سب لڑکیاں اور استانیاں قرآنی آیات کا ورد کیے جا رہی تھیں۔ کچھ خوف کے مارے روئے جا رہی تھیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مِدّی بھی آیت الکرسی کا ورد کر کے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتنے میں ایک اور دھماکے کی آواز سنائی دی مگر معلوم نہ ہو سکا کہ آواز کدھر سے آئی تھی۔ پھر لڑکیوں نے دیکھا کہ سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے سکول کی آیا چیختی چلاتی ہوئی آئی۔ دھماکے کی آواز آیا کے کوارٹر ہی کی طرف سے آئی تھی۔ اس کا دو سالہ بچہ ملبے تلے دب گیا تھا۔ اور وہ اس کو بچانے کے لیے چیخ و پکار کر رہی تھی۔

لڑکیوں کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ کوئی بھی عمارت کے نزدیک نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کسی لڑکی نے بھی آیا کی طرف توجہ نہ دی۔ مِدّی سے دیکھا نہ گیا۔ وہ اندھا دھند مصیبت زدہ آیا کے کوارٹر کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کو دیکھ کر دو اور لڑکیاں بھی کوارٹر کی طرف بھاگیں۔ کوارٹر کے کمرے کی چھت گری تھی۔ دیواریں

محفوظ تھیں۔ مِدّی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ملبے میں گھس گئی۔ بچے کی دردناک چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جس کمرے کی چھت گری تھی اس میں بستروں والی پیٹیاں بھی پڑی تھیں۔ بچہ ملبے اور پیٹی کے بیچ پھنس گیا تھا۔ مِدّی نے وہاں سے اینٹیں ہٹانا شروع کر دیں۔ پیچھے آنے والی ایک اور لڑکی بھی آگے بڑھی اور اینٹیں ہٹانے میں اس کی مدد کرنے لگ گئی۔ تھوڑی سی مشقت کے بعد انھیں بچہ ملبے میں نظر آ گیا۔ مِدّی نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر اس کو کھینچا۔ اسی زور آزمائی میں اچانک مِدّی کا پاؤں پھسلا اور وہ منہ کے بل اینٹوں پر گر گئی۔ اس کی پیشانی پر زخم لگ گیا اور خون بہنے لگا۔ مگر مِدّی نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جان کی پروا نہ کی۔ اسے بچے کی فکر تھی جو بری طرح چلا رہا تھا۔ مِدّی نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ بچے تک ہاتھ پہنچایا۔ جلد ہی بچے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ بچے کو کھینچ کر ملبے سے باہر نکال لائی۔ بچے کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ جسم پر صرف معمولی خراشیں تھیں۔ لیکن وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس لیے مسلسل چلائے جا رہا تھا۔ ماں اپنے معصوم بیٹے کو زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے کبھی اس کو پیار کرتی تو کبھی مِدّی کا سر چومتی۔ جب وہ بچے کو لے کر کوارٹر سے باہر نکلیں تو مزید استانیاں اور لڑکیاں بھی اکٹھی ہو چکی تھیں۔ سب انھیں کھینچ کر میدان میں لے گئیں۔ زلزلہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز کو بلا لیا گیا تھا۔ وہ زخمی بچوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ مِدّی کے سر پر بھی پٹی باندھ دی گئی۔ اُستانیوں نے مِدّی کو زمین پر لٹا دیا اور بچوں کو پیچھے ہٹا کر خود اس کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ یوں جیسے کسی خزانے کی حفاظت کر رہی ہوں۔

☆.....☆

چند دن کے بعد مِدّی تندرست ہو گئی۔ اس کی پیشانی سے پٹی تو اُتر گئی مگر زخم کا نشان ایک ستارے کی مانند اس کے ماتھے پر موجود رہا۔ اُنھی دنوں سکول میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ یہ تقریب زلزلہ زدگان کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے سجائی گئی تھی۔ مگر صرف چندہ اکٹھا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تقریب کی ایک اور خاص بات بھی تھی۔ وہ یہ کہ مِدّی کو "دلیر لڑکی" کا خطاب دیا جانے والا تھا۔ جب مہمانِ خصوصی نے مِدّی کے سر پر شہزادیوں جیسا تاج پہنایا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ یہی تاج والی تصویر پرنسپل صاحبہ نے ایک خوب صورت سے فریم میں جڑ کر اپنے دفتر میں آویزاں کی۔ تصویر میں بھی مِدّی کے ماتھے کا ستارا صاف نظر آتا تھا۔ اب مِدّی پورے سکول میں ستارے والی لڑکی کے نام سے مشہور تھی کیونکہ ہر دیکھنے والے کی نظر مِدّی کے ماتھے پر پڑتی تھی۔ سب اس کی ناک کو بھول چکے تھے۔☆

رنگ بھرنگی تھیلیاں

ماریہ فاروق

بھائی یہ سبزی کیسی دے رہے ہو؟'' بھائی جان ساٹھ روپے کلو۔ اچھا یہ ایک کلو بھنڈی آدھا کلو پالک اور تین لیموں دے دو۔ اچھا بھائی جان کہہ کر سبزی والے نے سبزی تولنی شروع کردی اور حسب معمول سبزیوں کو حتیٰ کہ لیموؤں تک کو الگ تھیلی میں ڈالا۔ ہم نے سبزی والے سے کہا یہ تم نے سبزیوں کا ٹھیلا لگایا ہے یا تھیلیوں کا۔ وہ ہمارے طنز کو سمجھ نہ سکا اور بس ہنس کے رہ گیا۔

☆.....☆

بازار کا پررونق ماحول ہے۔ لوگ مختلف دکانوں سے اشیاء کی خریداری میں مصروف ہیں۔ گو کہ سب ایک دوسرے سے شکل وصورت اور جسامت میں مختلف ہیں لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ کیا؟ وہ ہیں پلاسٹک کی تھیلیاں۔ مختلف رنگوں کی چھوٹی بڑی لال پیلی، ہرے نیلے ہر رنگ کے۔ ایسے میں سعدیہ اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ بازار میں داخل ہوئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کپڑوں کی دکان میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے ۵ کپڑے پسند کرلیے۔ ان تمام کپڑوں کو الگ الگ تھیلی میں ڈالا گیا۔ اب جب کپڑوں کا وقت آیا تو دکاندار نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بڑے سائز کی تھیلی میں ان تمام تھیلیوں کو منتقل کردیا۔ حالانکہ یہ سارا سامان صرف دو تھیلیوں میں بھی آسکتا تھا۔

☆.....☆

زید اور اس کی امی مارکیٹ سے باہر نکلے تو سامنے ہی سرخ سرخ کیے ہوئے تربوزوں کا ٹھیلا گاہکوں کو اپنی جانب متوجہ کررہا تھا۔ تربوز والے نے قاشیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ تراش کر سجا رکھی تھیں۔ زید کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے امی سے تربوز لینے کو کہا۔ امی نے حامی بھرلی اور

تقریباً پانچ کلو کے وزنی ایک تربوز خرید لیا۔ تربوز والے نے ایک کمزوری تھیلی میں تربوز کو ڈالا اور اس کو پھٹنے کے لیے ایک اور تھیلی میں ڈالا۔ حالانکہ وہ کسی مضبوط کپڑے کے تھیلے میں ڈال کر آرام سے گھر لایا جاسکتا تھا۔

☆.....☆

عید کی رات تھی۔ دودھ کی دکان پر بہت رش تھا۔ دودھ والا بڑی تندہی کے ساتھ گاہکوں کو دودھ دے رہا تھا اور دودھ کی تھیلی کو پھٹنے سے بچانے کے لیے دو اور تھیلیوں میں ڈال رہا تھا۔ چند سال پہلے تک تو مایہ چیزوں کو تھیلی میں ڈالنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ لوگ اپنے گھروں سے اپنا اپنا برتن لاتے تھے اور دودھ والا اپنے مقرر کردہ پیمانے سے ناپ کر اس میں دودھ ڈالتا تھا۔

☆.....☆

یہ شہر کے ایک پوش علاقے کی سڑک ہے۔ ایک طرف انواع واقسام کی دکانیں ہیں اور ان کے بیچ کسی کسی جگہ پر کوئی خالی پلاٹ ہے۔ جسے علاقے کے لوگوں نے کچرا کنڈی سمجھتے ہوئے اپنا کوڑا وہیں ڈالا تھا۔ اس کوڑے کے ڈھیر پر بھی ایک چیز بڑی مقدار میں موجود تھی اور وہ تھی.....

'تھیلی'۔ مختلف رنگوں کی مختلف جسامت کی لال، پیلی، چھوٹی، بڑی ہر طرح کی۔ اسی سڑک کے سامنے والی سڑک کے بیچوں بیچ ایک برساتی نالا ہے۔ جو رنگ برنگی تھیلیوں سے اٹا ہوا ہے۔ سڑک پر بھی ادھر سے ادھر اڑتی ہوئی تھیلیاں بہار دکھا رہی ہیں۔

☆.....☆

ان مشاہدات میں آپ کو بھی صداقت نظر آئی ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں آلودگی کا ایک بڑا سبب بننے والی ان پلاسٹک کی تھیلیوں سے ہمیں چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ ان سے زہریلے مادوں کا اخراج عمل میں آتا ہے۔ جب کچرا جمع کر کے کوڑے کے ڈھیر پر انھیں جلاتے ہیں تو یہ پگھل کر زہریلا دھواں دیتی ہیں جو فضائی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ ان سے نکلنے والا مادہ زمین میں جذب ہونے کے قابل نہیں ہوتا لہٰذا یہ زمین کی زرخیزی کو متاثر کرتی ہیں۔ پودوں کی نشو ونما پر برے اثرات ڈالتیں ہیں اس لیے خریداری کرتے وقت گھر سے کپڑے کا مضبوط تھیلا لے کر جانا چاہیے۔ ایک مضبوط تھیلی کو پھینکنے کے بجائے کئی بار مزید استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سبزی پھل اور غذائی اجناس کے لیے موٹے کاغذ کے تھیلے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنی سڑکوں کو گندگی سے بچا سکتے ہیں اور اپنی صحت کے مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

کوا اور ہنس

بسمہ شانزے پارس نواب

کافی عرصہ قبل حسین نامی ایک وادی تھی۔ جہاں ہر طرح کے چرند پرند آباد تھے۔ اس وادی کے بیچوں بیچ ایک جھیل تھی جس کا پانی آسمان پر اڑتے پرندوں کو بہت بھلا لگتا۔ جھیل کے دائیں کنارے ایک بلند و بالا چوٹی تھی اس چوٹی کے دامن میں نیم کے بے شمار درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ نیم کے درختوں میں سے ایک درخت کی شاخ پر ایک کوے کا گھونسلا تھا۔ گھونسلے کے ماتھے پر 'انوجیسٹ' کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ اسی نیم کے درخت کے موٹے تنے کو کھوکھلا کر کے پروفیسر قاضی نے ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا ہوا تھا۔ پروفیسر قاضی چونکہ ایک پروفیسر تھے اسی لیے ان کے دل میں جب بھی سکون سے مطالعہ کرنے کی یا کبھی کچھ نیا تخلیق کرنے کی خواہش انگڑائی لیتی تو وہ اسی کمرے میں آجاتے اور خوب مطالعہ کرتے اور اس کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی تحریر بھی قلم بند ہو جاتی۔ پروفیسر قاضی پرندوں کی زبان بھی باآسانی سمجھ لیتے تھے۔ اسی لیے وہ اکثر اپنا حقہ اٹھائے جھیل کنارے آ بیٹھتے اور پرندوں کی باتوں سے محظوظ ہوتے۔

کوا اکثر اپنے گھونسلے کی کھڑکی سے جھانک کر جھیل کا نظارہ کرتا تو وہاں پر ہنستے، کھیلتے، گنگناتے ہنسوں کو دیکھتا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی اسی طرح ہنسے گائے اور کھیلے لیکن افسوس وہ جب بھی ہنسوں کی طرح گنگناتے ہوئے ادھر ادھر گھوم

رہا ہوتا تو دوسرے پرندے اس کا مذاق اڑاتے اور کوا بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ ایک دن کوا جھیل کے کنارے بیٹھا ہنسوں کو گنگناتے اور ادھر ادھر اٹھکیلیاں کرتے دیکھ رہا تھا تو اس کا بھی دل چاہا کہ وہ ان میں شامل ہو کر خوشی کے گیت گائے۔ پھر کیا تھا کوا اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہنسوں کے پاس گیا اور گول گول گھوم کر خوشی کے گیت گانے لگا۔ اس نے جب اپنی بھدی آواز میں کائیں کائیں شروع کی تو سارے ہنس خاموش ہو گئے۔ جھیل کا کنارہ صرف کوے کی کائیں کائیں سے گونج رہا تھا یا پھر پروفیسر کے حقے کی گڑگڑ سے۔ چند پل یوں ہی گزر گئے۔ ہنسوں کا ٹولہ کچھ وقت تو دم سادھے کوے کو کائیں کائیں کرتے دیکھتے رہے لیکن پھر ایک دوسرے کے کان میں گھس کر کھسر پھسر کرنے لگے۔ قریب بیٹھے پروفیسر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا سوائے چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے۔ کچھ دیر تو ہنس وہیں کھڑے رہا جب کوے کی کائیں کائیں ان کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگانے لگی تو وہ آہستہ آہستہ وہاں سے کوچ کرنے لگے۔ انہیں کوے نے جب ٹھمک ٹھمک کر قدم اٹھاتے دیکھا تو خود بھی ان کی طرح ٹھمک ٹھمک کے قدم اٹھانے کی

کوششیں کرنے لگا لیکن وہ جب بھی ان کی نقل کرتا تو لڑھک کر ایک جانب گر جاتا۔ پروفیسر نے اسے اس طرح لڑھکتا دیکھا تو کوے سے کہنے لگے۔ ”انو میاں اس طرح تمھیں چوٹ لگ جائے گی، تم اسی طرح چلو جس طرح چلتے ہو۔“ انو کوے نے جب اپنے پرانے انداز میں چلنے کی کوشش کی تو پھر سے زمین بوس ہو گیا۔

یوں ادھر ادھر لڑھک کر وہ اپنے پر زخمی کر بیٹھا۔ دوسری طرف سارے ہنس چلے گئے سوائے ایک کے جو کوے کی حرکتوں کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوے کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے دیکھنے لگا۔ شاید اس ہنس کو اپنے کھیل میں کوے کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی اس لیے کوے کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ انو کوے نے اسے گھورتا دیکھ کر ڈر کے مارے اڑنے کی کوشش کی تو گر گیا۔ انو کو بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تبھی اس کی نظر جھیل کے کنارے ٹرٹر کرتے مینڈکوں پر پڑی، جو ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔ انو کوے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مینڈک کی طرح پھدکتا ہوا پروفیسر کے کمرے میں گھس گیا۔ ہنس نے طنزیہ نظروں سے کوے کو پھدکتا دیکھا اور پروفیسر کے قریب سے بڑبڑاتا گزر گیا لیکن اس بار پروفیسر نے ہنس کی بڑبڑاہٹ سن لی اسی لیے حقے کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگے کیونکہ انھیں اپنی ڈائری میں یہ تاریخی فقرہ لکھنا تھا کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ اس طرح یہ کہاوت خوبصورت وادی میں جنم لے کر پروفیسر قاضی کے ذریعے لوگوں میں پھیل گئی اور اب کوئی شخص کسی دوسرے کی نقل کرتا تو لوگ ہنس کی طرح طنزیہ نظروں سے دیکھتے اور پھر یہ فقرہ اچھالتے گزر جاتے ہیں کہ ’کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔“ (ماخوذ)

☆.....☆

قصہ پانچ روپے کا

حمدی محسن

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دس سال کا تھا۔ اماں سے ملنے والے جیب خرچ کو ہوا میں اڑا دیا کرتا تھا۔ بچت کرنا میری عادت نہ تھی۔ کبھی مٹھائی مول کر کھالی، کبھی کبھار اس سے مٹی کے کھلونے لیے اور چند ہی لمحوں میں توڑ کر برابر کر دیتا۔ میرے بہن بھائی میرے برعکس بچت کرنے کے عادی تھے۔ حالانکہ خورشید مجھ سے ایک سال اور رخشندہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارے زمانے میں بچوں کو پیسہ بنانے کا بہت شوق تھا۔ ادھر پڑوس کی خالہ کا بجلی کا بل پچیس روپے جمع کرایا اور اٹھنی خالہ کی طرف سے عنایت ہوئی۔ اختر صاحب کی کھڑی ’مورس‘ کا رحکم ملنے پر چھکا ماری اور تیس پیسے ہمارا انعام۔ مگر یہ سب میرے بہن بھائیوں کی عادت تھی۔ میں تو ان چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔

یونہی ہم ایک شام اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ رمضان کا مہینہ اور سردی زوروں پر۔ ہم عصر کی نماز پڑھ کر آئے تھے جبکہ ہمارے بہن بھائی اپنی جمع پونجی کھول کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پاس تو خیر سے ساڑھے چار روپے جمع ہو سکے ہیں عید کے لیے۔ رخشندہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا! میرے پاس تو صرف تین روپے ہیں۔ اس میں سے بھی پچاس پیسے کی امرتی کھلانے کا وعدہ کیا ہے صلاح الدین سے۔'' خورشید کے لہجے میں تاسف تھا۔

''آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں بھیا؟''

''زیادہ نہیں، صرف بیس روپے۔''

''بھئی مجھ کو تمھاری طرح بچت کرنا نہیں بھاتی۔'' میں بیزاری سے گویا ہوا۔

''ہے بھیا! کتنے مطلبی ہوگئے ہو۔ نہ ہم کو بڑے بھائی ہونے کے ناطے عیدی دیتے ہو نہ دوستوں کے واسطے کوئی تحفہ لیتے ہو۔ اور نہ ہی ہماری طرح بچت کرتے ہو۔'' رخشندہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''تم سست ہو فیاض تمھیں کسی کا خیال نہیں۔'' خورشید تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

''خاموش رہو! مجھے یہ طریقہ بالکل نہیں پسند! تمھیں بھائے تم اپناؤ۔'' میں یہ کہہ کر دروازہ دھڑام سے بند کر کے چلتا بنا۔ میں گھر کے باغ میں اپنی کھوئی ہوئی گیند ڈھونڈ رہا تھا جب اماں نے آواز دی ''فیاض بیٹا!'' میں ان کے پاس دوڑا چلا آیا ''جی اماں''

''جابر کت خان کے پاس سے چھے سموسے لیتا آ اور ہاں برابر ہی دودھ والے کو کل کے دودھ کے واسطے پانچ روپے دیتا آ، کل دام دینا بھول گئی تھی۔''

سموسے خرید کر دودھ والے کو پیسے لوٹانے کو جونہی ہاتھ جیب میں ڈالا تو پریشانی سے واسطہ پڑا۔ ''یا خدا! پورے پانچ روپے تھے کدھر غائب ہوگئے؟'' چپ چاپ گھر کو روانہ ہوگئے۔ اماں کو بالکل نہ بتایا کہ ہم ان کے پیسے گرا آئے ہیں۔ سموسے پکڑائے اور سیدھا رخشندہ اور خورشید کے پاس پہنچے۔

''تم لوگ مزید پیسے کیسے بناؤ گے؟''

''یہ بھی کوئی بات ہے؟ میں پڑوس والی نانی زبیدہ کی ٹانگیں دباتی ہوں اور زرینہ چچی کی بیٹی کو سنبھالوں گی جب وہ بازار کو جائیں گی۔''

''اور میں راحت چاچا کے پودوں کو پانی دے کر اور صبیحہ مائی کے گھر کے آگے سے برف ہٹاؤں گا، میرے تو پیسے بن گئے۔'' یہ جوابات میرے لیے کافی تھے۔ اس شوق میں لوگوں نے مجھے کم ہی دیکھا تھا۔ پہلے تو مجھے کام کرتا دیکھ کر حیران ہوئے پھر میری توقع سے زیادہ مجھے پیسے دینے لگے۔ آخرکار میرے پاس دودھ والے کو دینے کے لیے پانچ روپے جمع ہو ہی گئے۔

میرا ارادہ افطار کے بعد دودھ والے کو پیسے دینے کا تھا جب اماں کی گرج دار آواز کانوں میں پڑی۔

''فیاض!''

کانپتے دل کو سنبھالتا اماں کے پاس گیا۔

''تیرے کرتے کی جیب میں سے یہ پانچ روپے نکلے ہیں۔ سچ سچ بولنا کہاں سے اٹھائے ہیں؟'' ہم تو ان روپوں کو دیکھ کر رو ہی پڑے۔

''ارے اماں، آپ کو پہلے بتا دیتا میں۔'' اور سارا واقعہ اماں کے گوش گزار گیا۔ اماں یہ سن کر ہولے سے مسکرائیں اور کہا ''اب تو خوش ہو جا اور دوسروں کو بھی خوش ہونے کا موقع دے۔'' یہ کہہ کر اماں چلی گئیں۔

عید کے دن میں اپنی جیب سے سب کے لیے مٹھائی لایا۔ خورشید اور رخشندہ کو عیدی دی، دوستوں کو عید ملوا کر لے جا کر جھولے جھلوائے اور اماں کے لیے بطور خاص ایک خوبصورت سی تسبیح لی اور بدلے میں دعائیں لیں اور وہ میری سب سے اچھی عید تھی۔

(انگریزی ادب سے ماخوذ)

☆.....☆

شجرۂ نسب

عرشیہ نوید حسنات

''آنٹی! متیب ہے؟'' فیضان نے متیب کی امی سے دروازہ کھلنے پر پوچھا۔

''جی بیٹا! اپنے کمرے میں ہے۔ اندر آ جاؤ۔'' فیضان جب متیب کے کمرے میں پہنچا تو اندر کا منظر اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ متیب بستر پر بیٹھا گھٹنوں میں سر دیے زار و قطار رو رہا تھا۔ آس پاس کاغذ ہی کاغذ بکھرے پڑے تھے۔

''متیب! متیب! کیا ہوا ہے تمھیں؟ آنٹی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں!''

''انکل نے؟''

''نہیں!''

''کوئی چیز چاہیے کیا؟''

''نہیں!'' تو اس منہ سے پھوٹ بھی دو۔ فیضان کو بھی غصہ آ گیا۔

''اور منہ اوپر کرو۔'' متیب نے منہ اوپر کیا ہی تھا کہ فیضان کو ہنسی آ گئی۔ اس کو پورا چہرہ روشنائی (ink) سے بھرا ہوا تھا اور وہ پورا 'زکوٹا جن' لگ رہا تھا۔

''متیب! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟ اور یہ آس پاس کاغذ کیوں بکھرے پڑے ہیں؟'' فیضان نے یہ کہتے ہوئے کاغذ اٹھا لیا۔ فیضان نے جب کاغذ پر لکھی عبارت پڑھی تو اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

''اچھا تو تم کہانی لکھ رہے ہو؟''

''ہاں!''

''لیکن رونے اور کہانی کا کیا ملاپ؟ آخر کہانی میں ایسا کیا لکھا ہے تم نے جس کو پڑھ کر تم خود ہی رو دیے۔''

''میں کہانی ہمیشہ لکھتا ہوں لیکن.....''

''ہاں بولو لیکن..... لیکن کیا؟''

"لیکن میری کہانی شائع نہیں ہوتی۔ میں دس، پندرہ کہانیاں لکھ کر بھیج چکا ہوں لیکن ان کو پتہ نہیں کیا مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے جو کبھی غلطی سے ہی میری کہانی شائع کردی ہو۔ وہ تو ہمیشہ اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کی ہی کہانیاں شائع کرتے ہیں لیکن میں ان کا رشتہ دار تھوڑی ہوں جو وہ میری تحریریں شائع کریں۔ اب اگر میں نے دوبارہ کبھی کہانی لکھ کر بھیجی تو میرا نام بھی مقیب نہیں!" اس نے جذبات میں آ کر اپنا سارا غصہ فیضان پر ہی نکال دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" فیضان نے اچھا پر زور دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ویسے میں ان کا رشتہ دار تھوڑی ہی ہوں لیکن پھر بھی وہ میری تحریریں شائع کرتے ہیں۔ کیا اس بات کا تمھارے پاس کوئی جواب ہے؟"

فیضان تھوڑی دیر رک کر دوبارہ گویا ہوا۔ "دیکھو مقیب! کیا تم نے کبھی بھی کہانی لکھ کر اپنے امی ابو یا اور کسی بڑے سے کہانی پڑھوائی ہے؟ نہیں نا۔ کیا تم نے کہانی لکھتے ہوئے یہ سوچا ہے کہ جو کہانی میں لکھ رہا ہوں۔ کیا خود میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ نہیں سوچا ناں۔ انہوں نے کہانی لکھنے کے جو اصول متعین کیے ہیں کیا تم ان تمام اصولوں پر عمل کرتے ہو؟ یقیناً تمہارا جواب نہیں ہے۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمھاری لکھی ہوئی کہانیاں شائع نہیں کرتے اور جہاں تک بات ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور اعزا و اقربا کی ہی تحاریر شائع کرتے ہیں تو یہ سراسر غلط ہے۔ ویسے ہم بھی ان کے رشتہ دار ہی ہیں۔"

"وہ کیسے؟" مقیب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فیضان کی طرف دیکھا۔

"ارے یار! اچھا یہ بتاؤ ہم سب کس کی اولاد ہیں؟"

"اپنے امی ابو کی۔"

"اف! پاگل ہمارا تمام شجرۂ نسب جا کر حضرت آدمؑ پر ہی ختم ہوتا ہے اور ہم سب انہی کی اولاد ہیں تو وہ بھی تو حضرت آدمؑ کی ہی اولاد ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے رشتہ دار یا عزیز بھی تو ہو سکتے ہیں۔ ہیں نا؟"

"دھت تیرے کی۔" مقیب مسکرا دیا۔

☆.....☆

آپ بھی کر سکتے ہیں

زاہدہ عروج تاج

دن تو سارا مصروفیات میں نکل جاتا ہے سو میں روز رات میں ہی اخبار پڑھتی ہوں اور پھر ساری رات خبرنامہ کی فلم دیکھتے 'خوابوں میں' ہی گزرتی ہے۔ کئی بار سوچا کہ اخبار صبح سویرے ہی پڑھنے کا کام ہے مگر قارئین ہماری صبح شدید قسم کی مصروفیت میں ہوتی ہے۔ تو آج بھی اخبار پڑھنے کے

بعد بجلی، چینی، آٹا، آلو، گیس کا بحران، انوا، ڈکیتی اور رشوت ستانی کی کہانیاں اور سیاستدانوں کے ایک دوسرے پر الزام تراشی کی مصروفیت۔ کوئی ترقی کی خوشی کی خبر اگر ہو بھی تو اسے نمایاں کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھتے کیوں کہ اس میں شاید مسالہ کم ہوتا ہے۔ آج تو دل بہت ہی غمزدہ ہوا، میں نے سوچا قوم کے بچوں سے کچھ آئیڈیاز شیئر کرتی ہوں کہ اگر ہم سب کمر کس لیں تو ہوسکتا ہے ہماری ہی کوششوں سے ایک قابل رشک پاکستان وجود میں آجائے۔ ہوسکتا ہے آپ میری بات پر مسکرا دیے ہوں مگر یاد رکھیے آپ وہی چراغ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے "یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔"

پیارے بچو! اپنی صلاحیتوں کو پہچانیں۔ بامقصد زندگی گزاریں۔ آپ جس سطح پر ہیں جس حیثیت میں ہیں سوچیں آپ ملک وملت کے لیے کس طرح کارآمد فرد بن سکتے ہیں کیونکہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

میرے بچے جب بھی فارغ ہوتے ہیں تو میں ان سے کہتی ہوں کہ کالونی کا چکر لگاؤ۔ اخبارات وغیرہ ایک جگہ جمع کرکے جلا دو۔ لوگوں کو درخت پودے لگانے کے لیے اور گھروں کے باہر گھاس لگانے کی طرف راغب کرو اور یہ آنٹی اگر آپ باہر پودوں کو پانی نہیں لگا سکتیں تو ہمیں پائپ لگا دیں۔ ہم یہ کام کردیتے ہیں۔ شاید آپ سوچیں یہ تو کوئی خاص کام نہیں..... نہیں قارئین آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا کہ آپ کسی بھی سطح پر جو کچھ کرسکتے ہیں وہ کریں۔ ایک طالب علم محنت اور ایمانداری کو اپنا شعار بنائے۔ ایک استاد عمل واخلاص کو اپنا شعار بنائے۔ ایک دوکاندار ملاوٹ شدہ چیزوں سے گریز کرے اور پورے ناپ تول کو یقینی بنائے۔ ہر ملازمت پیشہ فرد اپنے فرائض پوری دیانتداری سے انجام دے۔ کسان کاشت کاری کے جدید طریقوں کو فروغ دیں۔

پولیس اور دیگر محکمے رشوت اور سفارش کی لعنت کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ عدالتیں عدل و انصاف کی فراہمی یقینی بنائیں۔

پیارے بچو! وقت بہت بڑی دولت ہے۔ آپ اس کو ضائع مت کریں اور پابندی وقت کو اپنا مقصد بنالیں۔ آپ سارے کام بہتر اور بھرپور طریقے سے انجام دے سکیں گے۔ پانی ضائع مت کریں۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر کریں۔ جب انسان نعمتوں کی قدر کرنا سیکھ جاتا ہے تو نعمتوں کے درست اور بھرپور

استعمال بھی آشنا ہو جاتا ہے اور یہ چیز نہ صرف اس کی ذات کو فائدہ دیتی ہے بلکہ اس سے ملک و قوم بھی مستفید ہوتے ہیں۔

پیارے بچو! پاکستان ہمارا پیارا وطن ہے۔ آیئے ہم آج یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنی ذات سے اپنے پیارے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ جہاں تک ہم سے ممکن ہوگا اس کی فلاح و بہبود میں حصہ لیں گے۔ اس کے لیے چاہے آپ ایک پودا لگائیں۔ پانی ٹپکاتے ہوئے نل کو ٹھیک کریں، فضول لائٹ بند کر دیں۔ اپنی گلی کو صاف رکھیں (گھر تو ہر کوئی صاف رکھتا ہے) دو نمبر چیزیں رکھنے والے دکانداروں کا گریز کریں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔ لوگوں کے کام آئیں۔ بزرگوں کو سڑک پار کروا دیں۔ اپنے سے چھوٹے بچے کی پڑھائی میں مدد کر دیں۔ سچ بولیں..... امانت و دیانت کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیں۔ یقین کریں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں (اگر ان پر عمل کیا جائے تو) چھوٹی نہیں ہیں یہ روشنی کے جگنو ہیں یہ روشن کلیاں ہیں یہ انسانیت کی روح ہے زندہ قومیں ان ہی خیالوں سے تعمیر ہوتی ہیں اپنے اچھے خیالوں کو (جو ملک و قوم کو فائدہ دے سکیں) عمل میں ضرور لائیں چاہے لوگ آپ کے ساتھ نہ چلیں۔ آپ اکیلے مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہیں ایک دن آپ بے ساختہ کہہ اٹھیں گے۔

میں تنہا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆.....☆

عیدی

اسماء سید

"آآآ.....!!" عمران نعرہ لگاتا ہوا آیا اور ایک بار پھر واش روم میں گھس گیا۔

"ہزار بار سمجھایا ہے زیادہ نہ کھایا کرو، مگر مجال ہے جو باز آجائے اب عید کا دوسرا دن ہے اور ان صاحب نے عید کا ایک ہی دن سمجھ کر سب کچھ منہ میں ڈال لیا اور اپنا یہ حال کر لیا۔" امی پریشان ہو کر بولیں۔

"اور ہاں امی! عمران نے منہ میں اتنا بھر لیا تھا کہ منہ سے کھانا گر رہا تھا۔" فاطمہ نے جب دیکھا کہ عمران واش روم سے باہر آ گیا ہے تو جھٹ سے بولیں۔

"ارے ہٹو اکون میرے بچے کو پریشان کر رہا ہے؟" دادی اماں نے جب عمران کو روہانسا ہوتے ہوئے دیکھا تو بولیں۔

"فاطمہ بھائی کو تنگ مت کرو اور دیکھو دروازے پر کون آیا ہے۔ ہو سکتا ہے حامد ہو اور عمران کی دوا لے کر آیا ہو۔" دادی جان نے پاندان سے پان نکالتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

"کون ہے؟" فاطمہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ باہر دیکھا تو ایک بچہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس اور بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ وہ کسی فقیر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

"معاف کرو! آج بکرا عید نہیں ہے جو تم گوشت مانگنے آ گئے ہو۔" فاطمہ نے چلا کر کہا اور دروازہ بند کرنے لگی۔ وہ

بچہ فاطمہ کو دھکا دیتے ہوئے اندر آ گیا۔

''ارے! ارے! باہر نکلو! یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' فاطمہ ہڑبڑا کر بولی۔

''فاطمہ کی بچی میں حامد ہوں۔'' حامد نے غصہ سے چلا کر کہا۔

''مگر تم نے یہ حال کیا بنا رکھا ہے؟'' فاطمہ نے نہ سمجھنے کے انداز میں کہا۔

''یہ حال! اوہ..... وہ میں نے نئی گن خریدی ہے اور صرف میں نے ہی نہیں ہم سب دوستوں نے نئی گنیں خریدی ہیں اور ہم گراؤنڈ میں counter strike کھیل رہے تھے تو ہمارا اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ تو قیر آؤٹ ہوا ہے یا نہیں؟'' حامد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اندر آؤ! ابھی امی تمہارا counter strike بناتی ہیں۔'' فاطمہ غصے میں بولی۔ لیکن حامد اتنا سیدھا تھوڑی تھا کہ امی کو اصل بات بتا دے۔ دوا فاطمہ کو تھما کر خود نہانے کے لیے گھس گیا۔

☆.....☆

کھانے کی میز پر سب زین کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

''ارے! یہ زین بھائی اتنی لمبی نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ چار گھنٹے تو اسی میں لگا دیتے ہیں!'' حامد کو اونگھتا دیکھ کر فاطمہ بولی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور زین اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم!'' زین نے باآواز بلند سب کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' سب نے مل کر سلام کا جواب دیا۔

''زین بھائی! آپ کو اتنی دیر کیوں ہو گئی؟'' ننھی ہدیٰ نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں نماز پڑھ رہا تھا۔'' زین نے ہدیٰ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر زین بھائی، آپ پچھلے چار گھنٹے سے نماز پڑھ رہے تھے؟'' فاطمہ حیران ہو کر بولی۔

''فاطمہ تم اتنی دیر سے غلط بول رہی ہو۔ بھائی چار نہیں بلکہ پون گھنٹے سے نماز پڑھ رہے تھے۔'' حامد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا جو زین کی آمد سے بیدار ہو چکا تھا۔ ''اچھا بابا! مان لیا پون گھنٹے سے نماز پڑھ رہے تھے مگر اتنی لمبی نماز!'' فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میں نے قرآن بھی پڑھا ہے۔'' زین نے فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بیٹا! بے شک لمبی نماز اور زیادہ قرآن پڑھا کرو۔ مگر مناسب اوقات میں پڑھا کرو۔ دوسروں کو انتظار کروانا بھی صحیح بات نہیں ہے۔'' ابو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ابو آئندہ خیال رکھوں گا۔'' زین نے ابو سے کہا اور

سب دعا پڑھ کر کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

☆.....☆

زین، فاطمہ، حامد، عمران اور ہدیٰ پانچ بہن بھائی تھے۔ زین کیونکہ سب سے بڑا تھا تو تھوڑا سنجیدہ تھا۔ فاطمہ شرارتوں میں سب سے آگے تھی۔ حامد بندوقوں کا دیوانہ تھا اور جب بھی نئی بندوق خریدتا تو ایسے چلتا جیسے ابھی دنیا فتح کر لے گا۔ عمران کا تو مت پوچھیں ہر وقت کھاتا رہتا تھا۔ اس لیے اکثر بیمار پڑ جاتا تھا۔ ننھی ہدیٰ تو کھلونوں سے ہی دل بہلا لیا کرتی تھی۔

☆.....☆

''کیا ہوا بیٹا! کیوں رو رہے ہو؟'' ابو جب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے عمران کو روتا پایا۔

''ابو! خالہ، خالو، علی، محمد اور مریم باجی کو سیر کرانے کے لیے لے کر گئے ہیں۔ ابھی فاطمہ آپی نے بتایا ہے۔ مریم باجی نے انھیں میسج پر بتایا تھا۔ اتنے دن ہو گئے آپ ہمیں سیر کرانے کے لیے لے کر نہیں گئے۔ میرا بہت دل چاہ رہا ہے۔'' عمران نے آنسو پونچھتے ہوئے وضاحت کی۔

''تو بیٹا آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا ہم ان شاء اللہ اتوار کے دن چلیں گے۔ ابو نے عمران کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

کھانے کی میز پر ابو نے گفتگو شروع کی۔ ''میں نے سوچا ہے کہ ہم اتوار کے دن سیر کرنے چلیں گے اور اگر سب اپنی عیدی کا کچھ حصہ ملا دیں تو اچھی پکنک ہو سکتی ہے۔ کیا آپ سب کو منظور ہے؟'' ابو نے سب سے پوچھا۔

''جی ابو!'' زین کے علاوہ سب نے ابو کے سوال کا جواب دیا۔

''زین بیٹا! کیا آپ کو منظور نہیں؟'' ابو نے زین سے پوچھا۔

''ابو اگر کوئی اپنی عیدی سے کچھ حصہ نہیں ملائے گا، تو کیا وہ جائے گا یا نہیں جائے گا؟'' زین نے الٹا سوال کر دیا۔

''ظاہری بات ہے وہ نہیں جائے گا۔'' فاطمہ نے شرارت میں کہا۔

''تو پھر میں نہیں جاؤں گا۔'' زین نے یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کیونکہ زین سیر و تفریح کا..... بہت شوقین تھا۔

''زین تم پیسے کیوں نہیں دو گے؟ فوراً بتاؤ کیا بات ہے؟'' ابو نے سختی سے کہا۔

''اگر آپ مجبور کرتے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر زین اپنے کمرے میں گیا اور جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بڑا سا گتے کا ڈبہ تھا۔ اس ڈبے سے اس نے تمام بہن بھائیوں کو تحفے نکال کر دیے اور ابو کی طرف مڑ کر بولا ''ابو کچھ پیسے بچے تھے میں نے وہ ایک فلاحی ادارے میں دے دیے۔'' یہ سن کر ابو کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ آئی۔ وہ اٹھے اور زین کو گلے لگا لیا۔ ''عیدی کا صحیح استعمال سیکھنا ہو تو زین بھائی سے سیکھیں۔'' پیچھے سے فاطمہ کی آواز آئی۔

☆.....☆

خط۔۔۔۔رے

چھوٹی عمر کے بڑے فنکار بلال سہیل لکھتے ہیں

جس کا تھا انتظار وہ شاہکار آ ہی گیا۔ واہ جی واہ! کیا سرورق ہے لیکن اس لڑکے کو چراغ ملا کہاں سے اور پھر سونے پے سہاگہ یہ کہ جن صاحب چراغ سے ساتھی لے کر برآمد ہو رہے ہیں۔ ویسے کیا اس لڑکے نے اپنے اسکول کے کام میں مدد کے لیے جن کو چراغ سے نکالا ہے؟ لیکن یہ کیا؟ لڑکے کی نظریں تو ساتھی پر مرکوز ہیں کہ یہ جن کی تصویر ساتھی میں کیا کر رہی ہے؟ خیر سرورق کا ذکر لمبا ہو گیا ہے۔ اس لیے آگے بڑھتے ہیں۔ 'او کاپی کی تلاش' (احمد عدنان طارق) ہم نے نہیں پڑھی کیوں کہ جب ہمیں تلاش ہی نہیں کرنا تو پڑھیں کیوں؟ 'ایک جملے کی سزا' (اشتیاق احمد) اچھی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جلدی میں لکھی گئی ہے اس قسم کی ان کی کہانی پہلے بھی نظر سے گزر چکی ہے۔ 'گنوار چی خانہ' (الیاس نواز) پڑھ کر مزہ آیا۔ رائیٹرز ایوارڈ کی تقریب میں الیاس نواز صاحب کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ پختہ عمر کے صاحب ہوں گے لیکن وہ تو بالکل نوجوان نکلے۔ 'ایک ملاقات ان کے ساتھ' بڑی دلچسپ ملاقات تھی اور سچ پوچھیے تو ہم نے انٹرویو پڑھنے کے بعد ہی پہلی بار عنایت علی خان صاحب کی کوئی نظم پڑھی۔ 'وہ تھے اپنے قومی شاعر'۔ 'دو شکار' (جاوید بسام) بھی اچھی تھی۔ ویسے یہ جاوید بسام صاحب صرف لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں کیا؟ کیونکہ جتنی باقاعدگی سے ان کی کہانی آتی ہیں شاید ہی کسی کی آتی ہوں گی۔ 'سیاہ ناخن' بھی مزے کی تھی۔ 'دو نمبر' (بینا صدیقی) بھی بہت اچھی تھی لیکن والدین کی محبت کے لیے لفظ 'دو نمبر' کچھ اچھا نہ لگا۔ ''ہم واپس آئیں گے'

جذبات کی ترجمانی کرتی وقار محسن صاحب کی آخری کہانی...... پڑھ کر دل افسردہ ہوگیا۔ کہانی کا موضوع ہی ایسا تھا۔ 'شاہین' (حماد ظہیر) بھی بہت اچھی تھی۔ "مخارے" یعنی ہمارے سامنے بڑے مخارکو اتنا کانا پیا کہ وہ آدھا ہی رہ گیا۔

▶ ـــہم نے کوشش تو کی لیکن ہمارا شریر قلم کانٹ چھانٹ کی تاک میں رہتا ہے۔

طویل وقفے کے بعد آمنہ خاندان پھر حاضر ہے......

سالنامہ اچھا تھا۔ رازداں کی تحریر نے مزہ دوبالا کر دیا۔ علامہ اقبال کے بارے میں معلومات اچھی رہی لیکن اس دفعہ علامہ اقبال کے اشعار پرمبنی کوئز کی کمی محسوس ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ علامہ اقبال کے اشعار پرمبنی سوالات پوچھے جاتے۔ ہمارے پسندیدہ رائٹر اشتیاق احمد کے انتقال کی خبر نے اُداس کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

ارم بلوچ محمد رفیق، نواب شاہ سے نامکمل پتے کے ساتھ آئی ہیں......

ہمیں سالنامے کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ اتنا موٹا تازہ رسالہ دیکھ کر منھ میں پانی آ گیا کہ اب یقیناً پڑھنے کو بہت کچھ ملے گا۔ سرورق دیکھ کر ہمیں الہ دین کی کہانی یاد آ گئی جس میں اس کے پاس جادوئی چراغ ہوتا اور اسے رگڑنے سے جن حاضر ہوتا ہے۔ ویسے ہمیں بھی ایسے ہی چراغ کی ضرورت ہے تاکہ ساتھی کا ہر شمارہ بروقت حاصل کر سکیں کیونکہ ساتھی اکثر ہمیں تاخیر سے موصول ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے سب سے پہلے 'مخارے' کھولا اور اپنا خط تلاش کرنے لگے جو کہ وہاں موجود تھا۔ 'اوکاپی کی تلاش' کہانی دو بار پڑھنے پر بھی سمجھ میں نہ آئی اور سر کے اوپر سے گزر گئی بھی اتنے کم عقل اور ناسمجھ جو ٹھہرے۔ اس کے بعد ہمیشہ کی طرح اطہر علی ہاشمی صاحب کا تبصرہ پڑھا جو کہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ 'ایک جملے کی سزا' اشتیاق احمد صاحب کی کہانی نہایت ہی شاندار تھی۔ اشتیاق احمد اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت الفردوس میں اعلا سے اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ 'ایڈیٹر کا جواب' ویسے ہم نے بھی ایک کہانی بھیجی تھی جس کا کوئی اتا پتا نہ ملا جس کے باعث آپ کو ایک اور تحریر ارسال خدمت ہے۔ امید واثق ہے کہ شائع نہیں کریں گے۔ 'مختوار چی خانہ' واہ وا، ساتھی میں کوکنگ شوز بھی آنے لگے ہیں ایسا نہ ہو کہ ساتھی والے کوکنگ کلاسز بھی اسٹارٹ کرا دیں۔ اگر کریں تو سب سے پہلے مجھے ہی اطلاع دیجیے گا۔ عبدالصمد بھٹی کا مضمون بڑی مشکل سے پڑھا اور پڑھنے کے بعد نیند آنے لگی۔ 'مرے سیل پر یو کے سے فون آ گیا ہے' احمد حاطب صدیقی صاحب کی کیا تعریف کریں، ہر بار ایک نئی مزیدار نظم کے ساتھ حاضر ہو جاتے ہیں۔ 'ایک ملاقات ان کے ساتھ' میں عنایت علی خان کا انٹرویو اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ جاوید بسام صاحب ایک مختلف موضوع پر کہانی لکھ کے آئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کہانی میں 'میاں بلاقی' کا ذکر نہیں ہے۔ کھٹی میٹھی غزل واقعی بڑی کھٹی میٹھی تھی۔ غزل پڑھنے کے بعد ہم نے صحرانشینوں کو ان کے ساتھیوں سے ملوایا۔ خضر نسیم صاحب معلومات کی فیکٹری کھول کر بیٹھے ہیں۔ 'عالم اسلام کی شاہکار مساجد' میں اس بار کراچی ہی کی ایک مسجد کے بارے میں پڑھا۔ ان شاء اللہ اگر کراچی آئے تو اس مسجد کی زیارت ضرور کریں گے۔ 'ذرا سوچ کر بتائیں کیا بتائیں' ہمیں کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ 'ذرا مسکرائیے' اس بار جاندار تھے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا 'سیاہ ناخن' موجودہ حالات کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی اگر سب لوگ ایسے ہی دیانت دار ہو جائیں تو پاکستان جنت بن جائے۔ 'دو نمبر' واقعی ماں باپ کا پیار ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ 'کم ظرف' واقعی انسان بڑا کم ظرف ہے۔ اب تیرتے رہو! انکل سائنسو کے بعد پروفیسر تیلی بھی تجربات کروا رہی ہیں۔ 'آسٹریلیا کی تلاش' ایک دلچسپ مضمون تھا۔ انٹرویو کے بعد عنایت علی خان صاحب کی نظم پڑھی جو اپنی مثال آپ تھی۔ ساتھی مصوری میں عرشیہ نوید حسنات کی مصوری پسند آئی۔ 'پرانے زخم' اور 'ہم

واپس آ گئیں گے' سنجیدہ تحریریں تھیں جن کو پڑھ کر ہم آبدیدہ ہو گئے۔ 'شاہین' (حماد ظہیر) کہانی نامکمل لگی۔ 'باغ کا سودا' لیجیے بھئی عظمیٰ ابو نصر صدیقی اپنی معصوم سی کہانی کے ساتھ حاضر ہیں۔ 'قاتل بلی کی ڈائری' اُف ۔۔۔ معصوم بلی پر کتنا ظلم کیا۔

سید فراز حسن موسم کا لطف لے رہے ہیں

میری طرف سے ساتھی کے تمام قارئین کو سلام۔ میں نے ایک ساتھی خریدا جو کہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس میں بے شمار کہانیاں تھی۔ موسم سہانا تھا تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں ایک نظم 'خوف' پڑھ رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ سب سچ ہو جائے گا۔

ارے سنا آپ نے ۔۔۔ سلویہ قاضی نے خود کو پاگل کہا ۔۔۔ خود دیکھ لیجیے

آج ہی سالنامہ ملا آج ہی پڑھ ڈالا۔ ساتھی چٹخارے پہ نظر دوڑائی اشتیاق احمد اور حماد ظہیر کی کہانیاں دیکھیں تو خوشی سے پاگلوں کی طرح اُچھلنے لگ گئے۔ پھر دیکھا کہ گھر میں سب ہمیں واقعی پاگل سمجھ رہے ہیں۔ اپنی خوشی پہ قابو پاتے ہوئے ساری کہانیاں ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالیں۔ تمام ہی کہانیاں بہترین تھیں۔ اشتیاق احمد صاحب کی کہانی کا اختتام کچھ سمجھ نہیں آیا۔ کیا آپ تھوڑی روشنی ڈالیں گے؟ آخر میں آتے ہیں خطوں کی طرف سیدہ سائرہ سکندر کا خط پڑھ کر تو ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے اور پھر اپنے خط پہ اپنا نام ٹھیک پا کر خوشی ہوئی لیکن لفظ (جنوری) دیکھ کر پیٹ میں درد ہو گیا۔

ناہید ضمیر حسین چھوٹے سے خط میں لکھتی ہیں

ساتھی کے سالنامے نے تو دل ہی خوش کر دیا۔ اس سالنامے میں بہت سی کہانیاں اچھی تھیں۔ 'کنوارہ چی خانہ'، 'ہم واپس آ ئیں گے' اور 'ساتھی مصوری' کا سلسلہ لاجواب ہے۔

حیدرآباد سے حافظ محمد ارقم لکھتے ہیں

سالنامے میں اشتیاق احمد کی کہانی 'ایک جملے کی سزا' زبردست کہانی تھی۔ 'کنوارہ چی خانہ' پسند آئی۔ 'سیاہ ناخن' پاکستانیوں کی عظمت کو اُجاگر کر رہی تھی۔ 'دو نمبر' حقیقت کے قریب لگی۔ نظموں میں 'مرے سیل پہ UK سے فون آ گیا ہے' اور 'کھٹی میٹھی غزل' ان کا جواب نہیں۔

شمین جاوید بسام کے منھ میں پانی آ رہا ہے، وہ بھی سالنامہ دیکھ کر ۔۔۔

اس دفعہ سالنامے کی صحت دیکھ کر منھ میں پانی بھر آیا۔ دل چاہا جلدی سے پورا رسالہ چٹ کر جاؤں۔ سب سے پہلے اپنے ابو کی کہانی ڈھونڈی اور کہانی کے آگے ان کے بارے میں پڑھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ اس دفعہ آپ نے قلمکاروں کے بارے میں بتا کر بہت اچھا کیا۔ کہانیوں میں کوئی ایک کہانی اچھی ہو تو بتاؤں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ 'کم ظرف' بہت مزیدار تھی۔ لطیفے بھی نئے نئے پڑھنے کو ملے۔ غرض یہ کہ پورا رسالہ سپر ہٹ تھا۔ براہ مہربانی میرا اخبار روی کی ٹوکری میں نظر نہیں پھینکیے گا سنا ہے وہ بہت پیٹو ہے۔

سالنامے پر راحت عائشہ تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں

نومبر کا سالنامہ جلد موصول ہو گیا تھا اور جلد ہی پڑھ ڈالا۔ نومبر کے مہینے میں ہونے والی ساتھی کی رائٹرز ایوارڈز کی تقریب بھی بہت دلچسپ رہی۔ زیادہ دلچسپ اس لیے بھی کہ اس میں ہمیں بھی بہترین کہانی کا ایوارڈ دیا گیا۔ اور ہم نے مزید دلچسپ اسے اس طرح بنایا کہ اپنی ایک بہت اچھی سہیلی رابعہ حسن جو کہ مظفر آباد کشمیر کی باسی ہیں اور اس تقریب میں شرکت کی متمنی تھیں لیکن چند وجوہ کی بنا پر نہ آ سکی۔ انھیں لمحہ بہ لمحہ کوریج پہنچاتے رہے۔ جس پر بیک وقت وہ خوش بھی تھیں اور افسردہ بھی۔ اسی ماہ کی ایک خبر انٹرنیشنل کتب میلہ تھا جس کا ہمیں انتظار رہتا

ہے۔ کتب میلے میں خوشی خوشی شرکت کی وہاں ہماری ملاقات اشتیاق احمد صاحب سے ہوئی جو ساتھی کے بالکل سامنے والے اسٹال پر تشریف فرما تھے۔ اس سال بھی ہم نے ان سے آٹو گراف لیا اور اگلے ہی دن ہم نے وہ روح فرسا خبر سنی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ اتنی اچانک ایسے چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہر دعا کے بعد ان کی مغفرت کے لیے خود بخود دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ پاک ان کی کوششوں کو اپنی بارگاہ میں قبول کرے۔ آمین۔

طوبیٰ بنت فاروق اپنے قلم کے جوہر دکھانے پر تلی ہوئی ہیں

سالنامہ دیکھ کر جہاں باقیوں کو خوشی ہوئی وہیں ہمیں افسوس ہوا اور ساتھ میں غصہ بھی آیا۔ اب آپ پوچھیں گے وجہ تو وہ یہ کہ کچھ مہینوں سے ہمیں یہ شوق ہوا ہے کہ اتنے برسوں سے ساتھی پڑھ رہے ہو تو اس لیے کچھ لکھیں بھی۔ صلاحیتیں تو پہلے سے تھیں لیکن ابھر کر سامنے اب آ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے تمام مصروفیات ترک کرتے ہوئے دل و جان سے کہانی لکھیں۔ ہزار دفعہ لکھی ہزار دفعہ پڑھی اور اسی کے ساتھ ایک خط بھی لکھا اور روانہ کر دیا لیکن آپ نے ذرا پروانہ کرتے ہوئے دونوں کو دفن کر دیا۔ دل نے کہا اب نہ ساتھی پڑھنا نہ کچھ لکھنا لیکن شوق غالب آ گیا سو تبصرہ کیے دیتے ہیں۔ سرورق دیکھ کر بھائی بولا' اتنا بڑا ساتھی تو نہیں ہوتا جتنا جن کے ہاتھ میں ہے اور تو اور بچے کی کتابوں سے بھی بڑا۔'' بھئی وہ جن کا ساتھی ہے ناں اس لیے بڑا ہے۔' ہمارا جواب تو یہ تھا۔ کہانیوں میں 'دو نمبر'، 'گنوار چی خانہ' اور 'کم ظرف' پسند آ گئیں۔ 'ایک جملے کی سزا' کا اختتام سمجھ نہ پائے۔ اور نظموں میں 'کھٹی میٹھی غزل' اور 'سچے موتی' زیادہ پسند آ گئیں۔ اچھی تو سب ہی تھیں لطیفے اچھے تو تھے مگر ہمیں مزہ نہ آیا کہ ہمارے بھیجے گئے ان گنت لطیفوں میں سے ایک بھی نہ پایا۔ خط کافی لمبا ہو گیا۔ آخری بات سن لیں کہ 'یہ راز دان صاحب' ہمیں پتا ہے۔

⬅......اگر یہ ہم نے بتا دیا کہ رازداں کون ہیں تو وہ رازدان نہیں رہیں گے ویسے آپ نے جس طرف اشارہ کیا ہے وہ تو نہیں ہیں۔ ہاں جی......اکیا سمجھے۔

سیدہ سائرہ سکندر اپنا نام لکھنا پھر بھول گئی تھیں......

سالنامے میں اپنا خط دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کیونکہ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ میرا ایسا خط شائع ہو جائے گا۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے میری اصلاح فرمائی۔ بہت بہت شکریہ۔ سالنامے کا بہت شدت سے انتظار تھا لیکن آخر کار وہ وقت آ ہی گیا۔ جب سالنامہ ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ 'ایک جملے کی سزا' بہترین تھی۔ 'سیاہ ناخن' اور 'ہم وطن واپس آ گئیں گے' بہترین کہانیاں تھیں۔ 'شاہین' بہت ہی عجیب و غریب تھی لیکن سبق بہت ہی جاندار تھا۔ 'بے ستون گنبد والی مسجد' پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے میں اسی مسجد میں ہوں۔ 'دو نمبر' بھی اچھی کہانی رہی واقعی آج کل ہر جگہ 'دو نمبری' چل رہا ہے اور جس طرح 'گنوار چی خانہ' میں آپ نے کھانا تباہ و برباد کیا ہے ناں اُف ف ف بہت دکھ ہوا۔ آپ کی نگارشات میں بھی چھوٹی چھوٹی تحریریں رنگ بکھیر رہی تھیں۔ پروفیسر عنایت علی خان سے ملاقات بھی خوب رہی۔ ارے ہاں جاوید بسام کی کہانی بھی عمدہ تھی اور اس بار نظمیں تو اتنی اچھی تھیں اتنی اچھی کہ بس کیا ہی کہنے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

⬅......خط کے آغاز یا اختتام میں اپنا نام لازماً تحریر کیا کریں۔

حبیب اللہ نے لکھا ہے

یہ میرا ساتھی میں پہلا خط ہے۔ امید ہے کہ سب ساتھی مجھے خوش آمدید کہیں گے اور مدیر انکل میرے خط کو ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالیں

گے۔نومبر کے شمارے کا سرورق سالنامے کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔'دل پہ دستک' میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بہت اچھے طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔'کنوار چی خانہ'(الیاس نواز) ایک ہنستی مسکراتی تحریر ہے۔'ایک جملے کی سزا'(اشتیاق احمد مرحوم) کی ایک بہت زبردست کہانی ہے جس رات مصنف کا انتقال ہوا اس وقت وہ ایکسپو سینٹر سے ہو کر جا رہے تھے۔جس کی وجہ سے ان کے دیدار ہوئے۔ان کے انتقال سے بچے ایک عظیم کہانی نویس سے مرحوم ہوئے۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔'شاہین '(حماد ظہیر) کے تو کیا ہی کہنے بہت زبردست کہانی ہے۔ساری نظمیں اور مستقل مراسلے بہت اچھے ہیں۔اعظم بھائی نے ایکسپو سینٹر جو کتابیں مجھے تحفے میں دیں اسے پڑھ کر میرے علم میں بہت اضافہ ہوا اور بہت خوشی بھی۔اعظم بھائی! تحفہ دینے کا بہت شکریہ۔

بچوں کے معروف شاعر ضیا ءاللہ محسن نے ساتھی کے سالنامے پر عمدہ منظوم تبصرہ کیا ہے۔پڑھیے اور لطف لیجیے۔

ہیں وہ خوش قسمت کہ جن کو یہ خزانہ مل گیا
جس کے تھے سب منتظر وہ والہانہ مل گیا

دل لبھانے، مسکرانے کا بہانہ مل گیا
سالنامہ مل گیا جی، سالنامہ مل گیا

سرورق پہ ایک جن بابا بڑے حیران تھے
اس قدر موٹا رسالہ، دیکھ کر ہلکان تھے

پاس بیٹھا طفل کتب،ہاتھ میں لے کر چراغ
دل نشیں کردار یہ سب، سرورق کی جان تھے

دل پہ دستک دے کے ہم تھوڑا سا آگے بڑھ گئے
احمد عدنان طارق، کی کہانی پڑھ گئے

ایک بچے کی ذہانت سے قبیلے کے وہ لوگ
دیکھ لو پھر کامیابی کے وہ زینے چڑھ گئے

تبصرہ یوں ہاشمی صاحب کا ہوتا ہے کمال
جو بھی آئے سامنے،کلتی نہیں پھر اس کی دال

شوخ انداز بیاں میں ایک ناصح ہے چھپا
دیکھیے کس پیار سے وہ کھینچتے ہیں سب کی کھال

"ایک جملے کی سزا" نے سوچ کا اک پل دیا
اک بڑی اُلجھن کو دیکھو ،کتنا اچھا حل دیا

اشتیاق احمد ادب کا ایک روشن ماہتاب
آہ ! یہ درویش بھی اب دار عقبیٰ چل دیا

اب ہمارے سامنے تھا اک "ایڈیٹر کا جواب"
جس نے اُس معصوم بچے، کو کیا تھا لاجواب

نام چھپ جائے رسالے میں ہمارا دوستو!
اس لیے پھر ہم کو محنت کرنا ہوگی بے حساب

شاعروں کی بات ہو تو، معتبر اک نام ہے
آج کل بچوں، بڑوں میں جس کا چرچا عام ہے

دیکھ لو جی! یہ پروفیسر عنایت خان ہیں
شاعری کا وصف یہ، اللہ کا اک انعام ہے

پھر گئے جنگل میں ہم تو، پیڑ دیکھے بے شمار
اصغر و اکبر ، دلاور نے کیے تھے "دو شکار"

جستجو جو بھی کرے گا، سُرخرو ہوجائے گا
یہ سبق جاوید صاحب نے دیا ہے بار بار

احمد عاطب صدیقی، کا تخیل بے مثال
اب کی باری ان کے سیل پہ آگئی یو کے سے کال

ہر مہینے ان کی آمد، منفرد انداز میں
ان کی نظمیں پڑھ کے بچے خوب ہوتے ہیں نہال

اپنی "دو نمبر" کہانی لے کے جلوہ گر ہوئیں
دیکھیے بیٹا صدیقی کس طرح حاضر ہوئیں

ماں ہو یا کہ باپ، دونوں کی محبت لازوال
اس کہانی سے ہمیں باتیں یہی ازبر ہوئیں

شاہکار عالمِ اسلام کا دلکش سماں
مسجدِ طوبیٰ کا منظر کس قدر پیارا لگا
صرف ''سیاہ ناخن'' کہاں، ان کے تو دل بھی ہیں سیاہ
اے خدا تُو دشمنوں کو نیست و نابود کر
واہ جی وا! کیا بات ہے اقبال کے ''شاہین'' کی
یہ سبق حماد بھائی نے کہانی میں دیا
جب ''پرانے زخم'' دیکھے تو اُداسی چھاگئی
جانور ہو یا پرندہ، رب کی یہ مخلوق ہیں
آگیا سردی کا موسم، ہم چھپے تھے کہیں میں
مفت میں جو سیر کی تو دل مچل کر رہ گیا
''باغ کا سودا'' کیا تو خوب عزت مل گئی
جس نے راضی کر لیا، اللہ کا پیارا بنا
جگنوؤں کے گیت موضوع سے سجا تحسین وقار
'آئیں گے واپس' یہ کہہ کر خود بھی ہجرت کر گئے
آپ کے گھر میں چڑیلیں، بھوت یا جنات ہوں
'کم ظرف' سی آپا عشرت سے گزارش کیجیے
شور راتوں کو کریں اُودھم مچائیں بلیاں
''ڈائری بلی کی'' پڑھ کر ہم بڑے حیران تھے
ہم لطیفوں کے سمندر میں جو ڈبکی کھاگئے
سب لطیفے منفرد، سارے ہمیں اچھے لگے
حوصلہ کرکے جو ہم آگے بڑھے تو جا بجا
دید کے قابل تھی یہ 'خط رنے' کی محفل دوستو
چاہتوں کا ہے سماں، الفت کی پیاری داستاں
سالنامہ ہم کو ''ساتھی'' کا بہت اچھا لگا
آؤ میرے دوستو! ہم مل کے اک وعدہ کریں
اے خدا محسن کو دینا عمل کی توفیق بھی

گونجتی اللہ اکبر کی صدائیں ہیں جہاں
''اک مقدس فرض کی تکمیل ہوتی ہے یہاں''
چاہتے ہیں جو کہ ارضِ پاک ہوجائے تباہ
سارے بچے مل کے مانگیں اپنے رب سے یہ دعا
دیکھ لو یاسر کی سب نے کس طرح توہین کی
تم کبھی ''یاسر'' ہو، یہ خاص کر تلقین کی
یہ کہانی ماں کی عظمت کا سبق پڑھا گئی
ماں کی ممتا چیز کیا ہے، ایک ماں بتلاگئی
لے گئے پھر ہم کو طارق خان کنگرو دیس میں
اس طرح ہوتا ہے اکثر، اس طرح کے کیس میں
اک صحابی کو بڑی اچھی بشارت مل گئی
اس کو عظمت مل گئی، عقبیٰ میں جنت مل گئی
آخری تحریر ان کی، خوبصورت شاہکار
'محسنِ اطفال' پہ رحمت خدا کی بے شمار
کالا جادو یا کسی منتر کے کچھ ''اثرات'' ہوں
دیکھنا پھر اک تماشا، جو وہاں حالات ہوں
خوب گھر والوں کو دیکھو، آزمائیں بلیاں
ایسی ویسی، کیسی کیسی، دائیں بائیں بلیاں
قہقہوں کا ایک طوفاں، جس میں ہم پکڑا گئے
پر جو کول قاطمہ والے تھے، وہ تو چھاگئے
اپنی اپنی لے کے ڈفلی، ہر کوئی بیٹھا ہوا
چٹ پٹے ٹاے پڑھے تو دل بڑا ہی خوش ہوا
ننھے پھولوں کے لیے اک خوبصورت گلستاں
تاحشر اس کو خدا رکھے سلامت، شادماں
اب ترقی کی منازل کامیابی سے چڑھیں
نیک بن کر اپنے دامن میں سدا خوشیاں بھریں

☆......☆......☆